فلسفیوں کے خواب

فلسفیوں کے خواب

ان فلسفیوں، ادیبوں اور محققوں کے نظریات و تخیلات، جنہوں نے عہد یونان سے اب تک اشتراکیت و سرمایہ داری، سوسائٹی کی تشکیل، نظام حکومت، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ اور تہذیب و تمدن کا خاکہ پیش کیا ہے

مؤلفہ

سلامہ موسیٰ مصری

مترجمہ

عبدالوہاب ظہوری

نفیس اکیڈمی

قیمت دو روپیہ چودہ آنہ سکہ عثمانیہ　　عابد روڈ حیدرآباد دکن　　قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ سکہ کلدار

طبع اوّل — دسمبر ۱۹۴۶ء — ایک ہزار

مطبوعہ

انتظامی پریس

حیدرآباد۔ (دکن)

حرف آغاز

تہذیب وتمدّن کے ہر دَور میں چند ایسے مفکرین پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اپنے گرد وپیش کے حالات کا جائزہ لیا اور سوسائٹی کے نشیب وفراز کو ہموار کرنے کے لئے اپنے خاص معہودہ تصوّرات ونظریات پیش کئے، عقلیات کا بہت بڑا مرکز یعنی یونان اوّلین فلسفیانہ افکار کا گہوارہ تھا، جہاں افلاطون نے سب سے پہلے اپنا ایک علیحدہ اور مستقل بالذات نظام فلسفہ پیش کیا، جس کی ایک پائندہ نشانی "جمہوریت افلاطون" ہے، ایک دو صدیاں نہیں بلکہ مسلسل نو صدیاں بیت گئیں اس کی ٹکر کا کوئی فلسفی پیدا نہ ہوا، اس کا نظام فکر نہ صرف مسلمان فلاسفہ پر چھایا رہا بلکہ یورپ میں قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے بہترین دماغوں پر بھی مسلط تھا، تشکیل

جماعت اور نظام حکومت کے باب میں افلاطون نے جو نظریات پیش کئے اُن تمام سے قطع نظر کر کے اُس کے "نظریۂ رہبانیت" پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈھائی ہزار سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود وہ ابتک یورپ کے ذہنی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے؛

یہ کتاب جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے، مصر کے نامور ادیب و نقاد "سلامہ موسیٰ" کی کتاب "احلام الفلاسفہ" کا ترجمہ ہے، مصنف نے افلاطون سے لے کر عہد جدید کے منتخب اور نامور فلاسفہ و مفکرّین کے نظریات و تخیلات کے مختصر تشکیلی خاکے پیش کرنے کے بعد اُن پر اپنے نقطۂ نگاہ سے تنقید کی ہے، مصنف کے بعض تنقیدی زاویئے محل فکر و تامل اور مزید نقد و نظر کے محتاج ہیں، یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ مصنف کے نقطہائے خیال اور تنقیدی زاویوں پر مزید تنقیدی حاشیے چڑھائے جائیں چہ جائیکہ ہر فلسفی و مفکر کے خوابوں اور خیالوں کی انفرادی طور پر تعبیر و تشریح کی جائے۔

لیکن اِس کتاب کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس سے مفکرین و فلاسفہ کے اُن خیالات و افکار کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو قدیم زمانے سے عصر حاضر تک سوسائٹی کی تشکیل، افراد کی اصلاح اور انسانی ترقی و خوش حالی کے باب میں وقتاً فوقتاً پیش کئے جاتے

رہے ہیں، نیز ہمیں معلوم ہوگا کہ ادبا و فلاسفہ نے انسانی خوشحالی کے لئے جس قدر تشکیلی خاکے پیش کئے ہیں وہ تمام بہ قول مصنف کے گنجلک اور منتشر ذہنی طومار کی حیثیت رکھتے ہیں، آخر اُن کا سبب؟ —— بالکل واضح ہے! کیونکہ اُن کے پاس کوئی الٰہی و ربّانی سرچشمہ نہ تھا جس سے وہ فیض یاب و سیراب ہوتے اور پیاسی انسانیت کی پیاس بجھا سکتے؛

جب میں نے اپنی کتاب "اسلام کا نظام حیات" تالیف کی، تو خیال ہوا کہ اسلامی اصولوں کو اجاگر کرنے کے لئے فلاسفہ کے ذہنی دھندلکوں کو بھی پیش کر دیا جائے تاکہ اندھیرے اور اجالے میں تفریق ہوجائے اور اسلام کے وہ روشن پہلو، جو افراد کی اصلاح تعمیر سیرت اور سوسائٹی کی تنظیم کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں، منظر عام پر آجائیں، چنانچہ میں نے یہ کتاب "احلام الفلاسفہ" انتخاب کی، اور اس کا ترجمہ کیا، قارئین ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ لگا سکیں گے کہ اسلام کے تصورات حیات کس قدر روشن اور واضح

ہیں، اور قدیم و جدید فلاسفہ و مفکّرین کے خیالات و افکار کا
پس منظر اور پیش منظر کس حد تک تاریک اور
دُھندلا ہے ———————!!

اندراجات

عزیزی مسعود اقبال گاہندری کے نام

مقدمۂ مؤلف

دنیا میں ہر انسان کے لئے دو زندگیاں ہیں، پہلی واقعاتی زندگی جس میں انسان زمان و مکان کے ماحول سے متاثر ہو کر زندگی بسر کرتا ہے، دوسری خیالی زندگی جس کی انسان کو آرزو اور تمنا ہوتی ہے۔ ان دونوں زندگیوں میں وہی فرق ہے جو ایک موجودہ ناقص شئے اور خیالی کامل چیز کے درمیان ہوا کرتا ہے یا ان دو چیزوں کے مابین ہوتا ہے جن میں سے ایک ہمارے مقصد و مدعا کے خلاف موجود ہے اور ایک وہ جس کا ہمارے خیال و خواہش کے مطابق پایا جانا ضروری ہے۔

انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیال کے ذریعہ سے اپنے ماحول کے موجودہ حقایق میں سے جو چیز ناقص اور عریاں ہو اُس کو تکمیل کا دیدہ زیب لباس پہنا دے، ہم جس قدر اپنی عقل کو مقید کرنا چاہتے ہیں اور من مانی خواہشات میں بھٹکنے سے اسے روکتے ہیں اسی قدر وہ اگرچہ نیند کی حالت ہی میں کیوں نہ ہو ہم سے جدا ہو جاتی ہے اور ہمارے حقیقی نقص کو

وہم آمیز کمال کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ پس جو شخص دن میں بیداری کی حالت میں بھوکا رہتا ہے وہ رات میں اپنے خواب میں بہترین اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے، جو عاشق زار دن میں اپنی محبوبہ کے دیدار کے لئے مضطرب و بے قرار رہتا ہے رات کی سکون پرور گھڑیوں میں اس سے ہم کنار ہوتا ہے، حالانکہ وہ گہری نیند میں اپنے بستر پر پڑا رہتا ہے۔ ہم تو بیداری میں بھی خواب دیکھتے ہیں، چنانچہ ہم دل میں گذرنے والے حسین و جمیل خیالات کی بلندیوں پر پہنچ کر ان عالیشان محلوں کو دیکھتے ہیں جن میں ہم تصوری طور پر سکونت پذیر ہیں، بہترین گھوڑے ہماری سواریوں کو لئے جا رہے ہیں، ہم خدام و عوام سے شاہانہ انداز میں تخاطب کر رہے ہیں۔ نرم و مہین بستر پر بیٹھے ہوئے اپنی محبوبہ سے سرگرم ناز و نیاز ہیں۔ ہماری فرماں بردار اولاد ہے، خوش نما باغ ہیں جہاں ہم ہر روز سیر و تفریح کیا کرتے ہیں، غرض کہ یہ اور اس قسم کی بیشمار تخیل فریب چیزیں شب و روز اپنے تصورات کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اس لئے کہ ہم اپنے گرد و پیش کے موجودہ حقایق میں نقص محسوس کرتے ہیں، وہ عیش و نشاط پرور ساعتیں جن کی طرف عقل انسانی مجبور ہوتی ہے یہ ہیں کہ جسمانی امنگوں اور نفسانی خواہشوں میں یکسانیت اور توازن پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گہری مسرت کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ غم اور بادۂ عیش و عشرت کے جام لبریز میں رنج و مصیبت کے تلخ جرعات بھی پائے جاتے ہیں، جب زندگی کے

حقایق تکلیف دہ ہیں اور صفائی ذہن کو مکدر کر کے زندگی کی تلخیوں اور اُس کے آلام و مصائب کو جھیلنے کی وجہ سے اُس کو غور و فکر کی مشقت برداشت کرنے کے عادی بنا دیتے ہیں تو اب دماغ کے لئے سکون و راحت کا مقام یہی میں نظر آیا کہ وہ اپنے خیال میں اُن موجودہ حقایق کے مخالف اشیاء کی طرف متوجہ ہو اور اپنے لئے اس عالم کے علاوہ ایک دوسرے عالم کا نقشہ ایجاد کرے جہاں کا ذرّہ ذرّہ کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ہے۔

—— معلوم ہوا کہ ہر انسان دو عالموں میں زندگی بسر کرتا ہے، ایک واقعاتی عالم جو ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہتا ہے، دوسرا عالم خیال جو ہمیشہ کامل ہے ہمارے اس تصور کے مطابق جس سے ہم کمال مراد لیتے ہیں جب ہم کو حقیقت سے صدمہ پہنچتا ہے تو خیال کی طرف پناہ گزیں ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر واقعاتی عالم کو خارج میں ناقص، زوال پذیر اور صدمہ رساں دیکھتے ہیں تو ہم اپنے اندرونی ذہنی تصور کی طرف بھاگتے ہیں اور تلخ حقیقت کی بجائے خواب شیریں دیکھتے ہیں۔

خوابوں کو حقیر سمجھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے کیا کہیں دیوتاؤں کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے؟

اس بارے میں قدماء مصر سراپا درس عبرت ہیں جب امراء کاہنوں اور لشکریوں کی ایک قلیل جماعت ساری قوم پر ظلم و ستم ڈھانے لگی اور ملکوں کی

دولت و ثروت پر قابض ہو گئی قوم کے بعض بیدار مغز افراد نے دیکھا کہ وہ محرومی و بیکسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں سرمایۂ حیات اور عیش و عشرت کے سامان سے بے بہرہ ہو گئے ہیں تو انھوں نے اپنے عالم تصور کی طرف رجوع کیا اور ایک نئی دنیا ایجاد کی جہاں محروم و بیکس اور کمزور و مظلوم انسانوں کو پنجۂ استبداد سے نجات ملے اور وہ عیش و راحت کی پُر کیف اور مسرت بخش زندگی گذاریں۔ اس دنیا میں انھوں نے جو مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلی ہیں اس کا بہترین ثمرہ دیا جائے اور یہاں وہ زندگی کے وہ نشاط انگیز اور راحت رساں لمحات بسر کریں جو اس دنیا میں ناممکن تھے چنانچہ ان کا یہ خیال دامنِ حقیقت سے اُلجھ پڑا اور ان کے باطنی شعور نے ان کی ظاہری عقل و ادراک پر بغاوت کا علم بلند کیا اور اُن کی زندگی میں ایسا توازن قائم کر دیا جس نے دوسرے عالم کے موہوم جذبات و ادراکات کو پہلے عالم کے موجودہ آلام و مصائب کے مقابل کر دیا۔ یہاں سے اس الحادی نظریہ کا پتہ چلتا ہے جس کو بعض سوشلزم اور کمیونزم کے مؤیدین اور علمبردار اس وقت پیش کیا کرتے ہیں جب کہ وہ ادیان و مذاہب کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور قوم کو مذہب سے علیحدہ ہو جانے پر اُبھارتے ہیں کیونکہ ان کو اس توازن کا خوف دامنگیر ہے جسے ادیانِ عالم نے پیش کیا ہے جس میں سعادت مندوں کے لئے جزاءِ احسن اور بدبختوں کو سزائے

سخت متفر رہے اُن کی آرزو یہ ہے کہ وہ بہر صورت اپنے نفوس میں ایک ہیجانی کیفیت اور انقلابی تاثر پیدا کر دیں۔

فلسفی، اَدیب اور سائینس داں سب کے سب خواب دیکھتے اور تخیل آفریں دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں، یہ لوگ اوروں کی بہ نسبت اس وقت زیادہ سوچتے اور خواب دیکھتے ہیں جب کہ معاشی و اقتصادی امور میں اضطراب اور پیچیدگی واقع ہو جائے اور واقعات و مشاہدات سے خیالات کو نفرت سی پیدا ہونے لگے —— چنانچہ حوادث و مصائب کے اضطراب انگیز دَور میں جب کہ چاروں طرف سے انقلاب کے طوفان نظر آتے ہیں تو ہم تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(۱) یا تو ہم اس ماحول سے دور بھاگ کر کسی تیرہ و تاریک گوشہ میں پناہ گزیں ہو جائیں گے جیسا کہ ایک عبادت گزار اپنی زندگی زہد و عبادت میں گزارنے کے لئے کسی معبد میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے جس طرح سے ایک زخمی شیر اپنے غار میں چلا جاتا ہے۔

(۲) یا تو ہم انقلاب انقلاب کی مسلسل آوازیں بلند کریں گے جیسا کہ ایک اَدیب و فلسفی اور سائنس داں کا شیوہ ہوتا ہے کیونکہ یہ نہ لوگوں سے دُور بھاگتا ہے اور نہ صرف مدافعت پر اکتفا کرتا ہے بلکہ وہ اس سوسائٹی

کا انقلابی تصور کرتا ہے جو اس کو موجودہ سوسائٹی کے بجائے کر دے اس لئے وہ ہر ایک کے رگ و ریشہ میں انقلاب کی روح دوڑاتا اور دل و دماغ کے تاریک گوشوں میں شعور و ادراک کی بجلیاں برساتا ہے اور لوگوں کو اپنے تخیلات و نظریات کی طرف جو خواب کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس کے خیالات کو اپنے حقائق کے ذریعہ سے بدل دیں۔

ہر ایک انسان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے انسانی طبائع متضاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مناسبت رکھتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا ہوگا جو بعض اوقات سوسائٹی کو چھوڑ کر کہیں دور خاموش اور سکون پرور فضاء میں بھاگنے کا قصد نہ کرتا ہو امریکہ کی جانب ہجرت اسی وقت ہوتی ہے جب کہ یورپ سے فرار ہو جانے کا قصد کیا جائے۔ ہم میں ایسے اشخاص بھی ضرور پائے جاتے ہیں جو بعض اوقات اپنے ماحول سے مدافعت و مقابلہ کرتے ہیں اُن کے اکثر و بیشتر حصہ میں ہمارا بھی وہی حال ہے جیسا کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو غذا کھانے کے بعد جب کہ اسکی باطنی عقل و شعور اس کے ظاہری فہم و ادراک پر چھانے لگے اور خیالات بلا کسی قید و بند کے لگاتار دل و دماغ پر وارد ہونا شروع ہوں گو چند ہی لمحات کیوں نہ ہوں وہ شخص خواب و خیال میں مصروف نہ ہوتا ہو۔

فلسفی اور اسی قماش کے دیگر مفکرین اس قدیم مصری کاہن کے

مخالف ہیں جو لوگوں کے خوابوں کو پیش کرتا ہے اِس لئے کہ فلاسفہ اپنے خواب کا مقام دوسرے عالم میں نہیں بناتے ہیں کیونکہ اُن کے ذہنی تصورات اسی عالم تک محدود ہوتے ہیں قطع نظر آسمانی فرشتوں کے اس زمین کے باشندے ہی اُن کے خیال وخواب کا موضوع ہیں۔ وہ آسمانی فرشتوں کے متعلق کبھی غور وفکر نہیں کرتے کیونکہ یہ اُن کا مطمح بحث ونظر نہیں ہیں پس فلاسفہ جب دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی میں بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور لوگوں کے معاملات میں ظلم وجور ہو رہا ہے تو وہ ایک ایسے مکمل نظام کے ایجاد کرنے کی فکر کرتے ہیں جس میں سعادت، راحت، صحت و عمران کی جملہ موہومی صورتیں بکمال درجہ پائی جاتی ہیں چنانچہ وہ ہمارے متعلق یہ سمجھ کر خواب دیکھتے ہیں کہ ہم اس زمین پر زندہ ہیں اُن کو ہماری موت کے بعد ہماری ذرا بھر پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ موجودہ زندگی ہی اصلاح کے بارے میں اُن کے غور وفکر کا موضوع ہے۔

ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہر وہ اصلاح جو گذشتہ زمانے میں رونما ہوئی یا آئندہ ہوگی وہ کسی فلسفی و متفکر کے خوابوں میں سے ایک خواب کا نتیجہ ہے۔ اناطول فرانس نے کیا خوب کہا ہے کہ:-

"گذشتہ زمانے میں اگر فلاسفہ کے خواب نہ ہوتے تو لوگ اب تک اندھیرے غاروں میں اسی قدیم طرز زندگی، بدبختی و عریانی کے ساتھ بسر کرنے پر مجبور

جو وجود میں آیا وہ کسی مفکر کے خیال وخواب کا نتیجہ تھا۔
بہترین اور متعدد خوابوں سے مستند حقایق کا ظہور ہوا ہے،
پس خیال ہی ترقی کا زینہ و مبداء ہے اُس کے ذریعہ سے
مستقبل کو بہترین اور شان دار صورت میں آشکارا کیا
جا سکتا ہے۔"

ہم نے قارئین کے سامنے بعض اُن مشہور خوابوں کو پیش کیا ہے جن کو فلاسفہ نے اپنی بیداری کے عالم میں دیکھا ہے اور فکر و نظر کی روشنی میں اپنے خیالات پیش کئے اس اُمید پر کہ اُن کے ذریعہ سے سوسائٹی کی اِصلاح ہو جائے۔ بعض خوابوں سے پتہ چلیگا کہ وہ کونسے اِصلاحات ہیں جن کو فلاسفہ نے پیش کیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک پر سوسائٹی اور ماحول نے کیا اثر ڈالا کس طرح فلاسفہ مدینۂ فاضلہ، حکومت فاضلہ، تشکیل جماعت، بہترین شادی، تعلیم و تربیت اور عمدہ نظام کے متعلق اپنے خیالات و نظریات پیش کرتے تھے۔

اِس میں شک نہیں کہ ایک مشاہد جب ایک نظریہ سے دوسرے نظریہ اور ایک خاکہ سے دوسرے خاکہ کی طرف منتقل ہوگا تو اسے ایسا محسوس ہوگا کہ اُس کا تصور اُسے عالم خواب کی رنگینیوں میں پہنچا رہا ہے۔ وہ بسا اوقات یہ گمان کرنے لگے گا کہ وہ خود اِن خوابوں میں شمار ہونے کے لایق بن گیا ہے

خواہ واقعہ اِس کے برعکس کیوں نہ ہو۔

چنانچہ مولف نے اپنے خواب کو انہی خوش حالیوں میں شمار کیا ہے اس کے پیش کردہ تصور کے مطابق جو شخص سعادت کی آغوش میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اُس کے لئے سعادت کے جملہ صفات و شروط بدرجۂ اَتم پائے جاتے ہیں۔

سلامہ موسیٰ

جمہوریۂ افلاطون

(ولادت ۳۴۷ھ ق۔م۔ وفات ۴۲۷ھ)

یونانی ادب دو چیزوں کی وجہ سے زندہ ہے۔ (۱) اندازۂ خیال (۲) حرّیت فکر۔ یہی وجہ ہے کہ یونان اب تک ہر تجدید ادب اور ارتقاء کے لئے روح رواں رہا۔ ایک مجدد فن اور ارتقاء کے پیشوا کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بشیار پابندیوں سے خواہ ان کا سرچشمہ شریعت ہو یا تقلید ایک دم آزاد ہو جائے پھر وہ اس وقت تک مجدد نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اس کا احساس حرّیت اوروں کے احساس سے زیادہ بسیط اور محکم نہ ہو۔ ایک دوسرا شخص جس امر کے متعلق اپنے دل میں محسوس کرتا ہے یہ مجدد خود اپنے نفس کے اندر فکری و ذہنی ریاضت کے ذریعہ سے جس میں اندازہ وخیال کو دخل نہ ہو، اس چیز کا مشاہدہ کرے اس طور پر کہ اگر ایک یونانی اُن کے خیالات کو معلوم کرے اور اُن کی روح سے سیراب ہو تو یہ بھی

ان کی طرح سے آزاد فکر اور روشن ضمیر ہو جائے اور بآسانی صحیح نتیجہ نکالنے کی جرأت پیدا کرے یہاں تک کہ یہ جرأت ایک یونانی کی طبیعت بن جائے جو اس کے مقدس یونانیوں کے ساتھ الفت اور تعلق رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

تاریخ کے صفحات پر یہ مقام نہایت تعجب اور حیرت پیدا کرتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ کی ترقی کا راز اس امر میں مضمر تھا کہ اس نے اپنے دو ہزار سال پیشتر کے گزرے ہوئے اشخاص کی تعلیمات وخیالات کو پیش نظر رکھکر اُن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہم ایک مجدد سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ عہد گزشتہ سے گزرے اور حاضر پر نظر ڈالے اور مستقبل کے رازہائے سربستہ معلوم کرے لیکن باوجود یونانیوں میں قدامت پسندی اور اسلاف پرستی ہونے کے اُن کے فکری اور ذہنی آثار میں برابر ہماری ذہنی بیداریوں کے سامان موجود ہیں جو ہر قسم کے موضوع میں ہر نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یونانیوں کے معارف وفنون اور ان کی معلومات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی معرفت کے لئے ہم محتاج ہوں بلکہ آزادی فکر وبحث اور جرأت مقال یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ہم ہر شعبۂ ارتقاء اور ہر نئی تحریک کے لئے محتاج رہتے ہیں، یہی مقام ہے جہاں یونانی روح ابد الآباد تک ادب و

فلسفہ میں ذہنی و فکری ترقیات کا باعث رہے گی۔

ہم یہاں یونانیوں کی جرات افکار اور حریت اذہان کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ارسطا طالیس اس بات کا قائل تھا کہ دیوتاؤں اور خداؤں میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ قوانین فطری و نوامیس طبعی میں تغیر و تبدل کر سکیں اسی بنا پر وہ کہتا تھا کہ خداؤں سے معجزات کا صدور نہیں ہو سکتا۔ تو قیدید اس شادی کو نہایت معیوب سمجھتا تھا جو اندازہ سے بلا انتخاب کر لی جاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ "ہم بیلوں اور گھوڑوں کی جفتی میں انسانوں سے زیادہ احتیاط برتتے ہیں، شریف لوگوں کی تعداد بہترین گھوڑوں سے بھی کم ہے، اس لئے کہ ہر انسان کو نسل کے اندر حق حاصل ہے۔ ارسطا طالیس حسن و جمال کو سعادت کی اولین شرط قرار دیتا تھا۔ افلاطون عورتوں کی اشتراکیت میں بحث کرتا تھا۔

ان ہی آزاد منش اور روشن ضمیر فلاسفہ کی جماعت میں ایک لطیف ادب ہر قسم کی قیود اور پابندیوں سے علیحدہ نشو نما پاتا رہا جو اب تک ادیبوں اور مصنفوں کے ذہن و دماغ میں آزادی فکر اور جرات ذہنی کی روح دوڑاتا ہے۔

اس لئے فلسفیوں کے خوابوں میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے افلاطون کے خواب سے بحث کریں تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ

وہ کونسا مدینہ فاضلہ (بہترین شہر) ہے جس کو افلاطون نے لوگوں کی خوشحالی اور اُن کے عیش و آرام کے لئے خیال کیا کیونکہ افلاطون کے بعد جتنے محققین اور فلاسفہ گزرے ہیں سبھوں نے اس اہم اور دلچسپ موضوع میں وہی پامال راستہ اختیار کیا ہے جن پر ان سے بیشتر افلاطون چلا ہے جس شخص نے بھی مدینہ فاضلہ کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے جمہوریہ افلاطون اس کے پیش نظر رہی جو اس کے حق میں الہام کی حیثیت رکھتی تھی، اس میں شک نہیں کہ "مدینہ فاضلہ" جس کا فارابی نے خیال کیا ہے بعض مقامات اور خیالات میں افلاطون کی موافقت کرتا ہے لیکن فارابی نے اپنے زمانہ کی روش اور عادت کے مطابق الہیات افلاطون پر اعتماد کیا، انسانی جمہوریت پر جس قدر اعتماد کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ اس نے اس حد تک الہیات پر بحث و شرح کی کہ کوئی انسان فارابی کے بہترین شہر اور جمہوریۂ افلاطون کے درمیان کوئی واسطہ نہیں پاتا۔

سنہ ۶۰۰ھ اور سنہ ۳۰۰ھ قبل میلاد کے درمیان کا زمانہ بلاد یونان میں شہروں کی تشکیل و تعمیر کا زمانہ تھا اس زمانہ میں سلطنت آج کل کی طرح چند شہروں، صوبوں اور اضلاع سے مرکب نہیں تھی اور نہ اس کی خارجی جائیدادیں ہوتی تھیں جو اس سے دور ہوں اور جن سے اہل یونان اپنے ملکوں میں واقف ہوں، اگرچہ وہ سن چکے تھے کہ ایران اور مصر میں اس

قسم کی تشکیل پائی جاتی ہے جب کبھی وہ کسی حکومت کا تصور کرتے تو ان کے ذہنوں میں شہر کی وہی خاص شکل و ہیئت مرتکز ہوتی؛ ملک بے تھے ان کے پاس کوئی شخصی قانون نہیں تھا۔ سوسائٹی کی تشکیل اور حکومت کے نظام کا بےنظیر اور رنگین خواب دیکھنے میں محض افلاطون ہی ایک فرد نہیں بلکہ ارسطاطالیس نے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کا دعویٰ بیجا ہے۔ ایاس نے بھی خیال پیش کیا ہے اور ملکیت کے حقوق میں مساوات کو واجب قرار دیا ہے۔

حبوامس نے بھی "بہترین شہر" کی حد بندیوں میں ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

لیکن اس کے باوجود جمہوریہ افلاطون ان تمام خوابوں میں ایک دائمی وجود اور ایک ممتاز و مخصوص اثر رکھتی ہے۔ افلاطون نے جمہوریت کا یہ تخیل اس دہشت انگیز اور خونریز جنگ کے بعد پیش کیا جس نے اپنے خوفناک پنجے اسپارٹا اور ایتھنس کے سخت جان اور ٹھوس جسموں میں گاڑ دیئے تھے جو ایک عرصہ دراز تک ان میں جاری رہی جس کے شعلے اطراف و اکناف تمام ملکوں میں پھیل گئے اور ان کو تباہ و برباد کر دیا اس کے بعد ہی اشتراکیت کے اثرات سوسائٹی کی فضا میں پرورش پانے لگے۔

تباہی و بربادی، فتنہ و فساد جیسے خونیں اثرات اور اشتراکیت جیسی اضطراب انگیز تحریکات جو ان خونریز جنگوں کی وجہ سے پیدا ہونے لگی

تھیں، لوگوں کی رگوں میں آزادیٔ فکر، جرأت فعال اور آتشین جذبات کی روح دوڑا کر ان کے تاریک ضمیروں کو روشن کر دیا، ان کو اس قدیم نظام سلطنت کی کمزوریوں اور بوسیدہ تمدن اور عمران کی خامیوں کا اقرار کرنا پڑا اور اس کے بجائے جدید تشکیل و نظام کی ضرورت محسوس ہوئی، جس طرح سر روسن نے جنگ عظیم کے بعد قوموں کی عصبیت کو ایجاد کرنے کی فکر کی اسی طرح افلاطون نے اسپارٹا اور ایتھنس کی خونریز جنگوں کے بعد جدید نظام ایجاد کرنے کا خیال کیا جس میں لوگ خوشحال اور فارغ البال زندگی بسر کر سکیں۔

افلاطون کے زمانہ میں سلطنت ایک ملک نہیں بلکہ ایک شہر کی حیثیت رکھتی تھی، اسی لئے اس کا خواب ملک کے وسیع دائرہ سے ہٹ کر ایک شہر تک محدود رہا بلکہ اس نے اپنے شہر کو اس قدر محدود بنا ڈالا کہ جسکے سارے رہنے والے ایک خطیب (لکچرار) کا لکچر سننے کے لئے جمع ہو سکیں یا یہ کہ کسی کھیل میں وہ سب شریک ہو سکیں یا آپس میں اس طرح دوستی اور تعارف ہو سکے کہ کوئی ایک دوسرے سے اجنبی اور غیر متعارف نہ رہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ آجکل موجودہ تعارف اور اشتراک رائے و عمل کے وسائل کی جو شکل ہم میں پائی جاتی ہے اس زمانہ میں نہیں تھی، ہم کوسوں دور کے فاصلہ تک بھی اخبارات، ٹیلیگرام، ٹیلیفون اور ڈاک کے ذریعہ سے تعارف بہم پہنچاتے رہتے ہیں، پھر آمد و رفت کے وسائل دور دراز مسافتوں کو قریب کر دیتے ہیں، باوجود دوری

کے اجتماع ممکن ہو جاتا ہے لیکن یہ حال افلاطون کے زمانہ میں نہیں تھا، اس لئے اُس نے اپنے شہر کو اتنا محدود بنایا جس کی آبادی تقریباً پچاس ہزار تک پہنچتی ہے، پس جمہوریہ افلاطون ایک شہر نما قریہ ہے، جس کے اِردگرد کھیت ہوں جنکی زراعت و کاشت کاری کے لئے خاص لوگ ہوں، یہاں کے باشندے درمیانی حالت میں ہوں، نہ زیادہ خوشحال ہوں نہ زیادہ غریب و فاقہ کش، اِس قدر خوشحالی بھی نہ ہو جس کے ذریعہ سے عیش و عشرت میں اُن کے جسم بھدّے اور فربہ اور حواس کمزور اور پراگندہ ہو جائیں اور نہ اتنا فاقہ اور افلاس رہو جو ان کے جسموں کو نحیف و کمزور کر دے اور محنت و مشقت سے باز رکھے، علاوہ اِس کے اِنتہائی فاقہ کشی اور خوشحالی یہ دونوں چیزیں علوم و فنون کے حق میں نہایت مضر اثرات اور تلخ نتائج پیدا کرتی ہیں، ایک یونانی کے لئے ہرگز یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسا بہترین شاہکار پیش کرے جس میں اَدب و فن سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچتا ہو، چنانچہ افلاطون کی جمہوریت سرمایہ داری اور افلاس سے خالی ہے، کیونکہ پہلی چیز سے خوشحالی و فارغ البالی پیدا ہوتی ہے تو دوسری سے دنائت طبع اور اخلاق کی کمزوری، یہ دونوں شر اور فساد کی موجب ہیں۔

بنی نوع اِنسان جمہوریت میں اپنی املاک میں مساوی درجہ رکھتے ہیں، اپنی حقیقی ضرورت و حاجت کے مُطابق وہ حاصل کر سکتے ہیں، لیکن بے ضرورت

ان کو اس میں سے کچھ نہ دیا جائے گا اس سے افلاطون کی غرض یہ تھی کہ لوگ خوشحالی اور سعادت میں زندگی بسر کریں لیکن یہ سعادت دنیاوی ناپائیدار چیزوں سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ ہمارے نفسوں اور ذہنوں کی بیداری سے مل سکتی ہے افلاطون کے پاس سعادت و مسرت کا وہ معیار نہیں جو ایک کثیر غذا کھانے والے کے پاس ہے کہ اس کو کھانا کھانے میں مزا آتا ہے۔ بلکہ حسن سعادت اور لطف مسرت کا معیار وہ ہے جو ایک رقاصہ اور مغنیہ کے پاس ہے کہ وہ جنبش و حرکت، نزاکت رفتار، حسن ادا، روانی نغمہ اور لطافت انداز سے محظوظ ہوتے ہیں اسی لئے افلاطون انسانوں کو ان کے املاک میں مساوی قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے پاس ہرگز جائز نہیں کہ انسانی سعادت کے اعتبار سے کسی کو دوسرے پر فوقیت دی جائے۔

اس جمہوریت میں اجتماعی ہیئت طبعی طور پر افراد سے تالیف پاتی ہے لیکن افراد کا یہ اجتماع بیکار محض یا ظاہر فریب حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ یہ اس طرح مرکب ہے جس طرح سے کہ ایک انسان کا جسم اس کے اعضاء سے ترکیب پاتا ہے پس ہر انسان سوسائٹی کا رکن ہے جس طرح ایک عضو جسم کی خدمت کرتا ہے اسی طرح اسے بھی اپنی بساط اور طاقت کے مطابق اجتماعی خدمت کے فرائض انجام دینا چاہیئے، سوسائٹی کے ارکان کے درمیان امن و سلامتی اور رابطۂ اتحاد و الفت اسی وقت برقرار رہتا ہے جبکہ

ہر ایک رکن اپنے فرائض خاص کرے جس سے وہ ذرا بھر تجاوز نہ کر سکے۔ چنانچہ اس جمہوریت میں عدل و انصاف ہی ایک شریف جذبہ ہے جو ہر انسان کو اس کے حقوق و مراتب عطا کرتا ہے اور ہر ایک کو اس کے مرتبہ اور منزل تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ ہم بزم سرود اور محفل سماع میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی جگہ سے اٹھکر باہر جاتا ہے تو پوری مجلس درہم برہم ہو جاتی ہے۔ نغموں اور سروں کا نظام دگرگوں ہو جاتا اور ان میں یکسانیت مفقود ہو جاتی ہے۔ کیونکہ محفل کے اثر کو لحن اور نغمہ کے ایجاد کرنے اور ان میں جذب و کشش پیدا کرنے میں خاص دخل ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ افلاطون اس بات کی کس طرح ضمانت لے سکتا ہے کہ ہر انسان اپنے کاروبار اور مرتبہ کو بلا تجاوز برقرار رکھ سکتا ہے۔

اب یہاں طبقاتی نظام ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اس نے اس کے تین طبقات مقرر کئے۔

(۱) طبقہ اوصیاء۔ یہ وہ طبقہ ہے جو فلسفہ اور حکمت کا درس دینے اور جمہوریت، سیاست اور سلطنت کے اہم امور کی تدبیر کے لئے مخصوص ہے۔

(۲) جنگجو طبقہ۔ جس کے ذمہ ملک اور حکومت کی حفاظت و حمایت ہے۔

(۳) طبقہ مزدور۔ جو زراعت اور کاروباری فرائض انجام دے۔

افلاطون نے طبعی طور پر پہلے دو طبقوں پر زیادہ زور صرف کیا۔ وہ تیسرے طبقہ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ یہ محکوم رعایا ہے جس کا سرپرست اوصیاء کا طبقہ ہے۔ اس کے دائرۂ حکم و اقتدار سے گریز کا کوئی چارہ نہیں، ان سے کمتر درجہ جنگجو طبقہ کا ہے جن میں ان کا تسلط و اقتدار نافذ ہوتا ہے۔ یہ طبقات اس قدر جامد نہیں کہ ان میں سے کوئی طبقہ دوسرے طبقہ میں شامل ہی نہیں ہو سکتا بلکہ ہر وہ شخص جو تربیت اور نشو و نما کے ارتقائی منازل طے کر چکا ہے ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں ترقی کر سکتا ہے۔

افلاطون نے گروہ اوصیاء اور جنگجو طبقہ کو ملکیت اور ازدواجی تعلقات کے حقوق سے بالکل علیحدہ کر دیا اور ان دونوں میں سے کسی کی اجازت نہیں دی لیکن طبقۂ عمال کے لئے ان کو باقی رکھا۔ افلاطون نے ان دونوں طبقات کی خاص مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں ملکیت و ازدواج کے حقوق سے انہیں محروم رکھا اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ان کے افراد ایک خاص نظام کے ماتحت رہیں یہاں تک کہ ہر طبقہ کے افراد ایک خاص رنگ اختیار کر لیں اب سوال یہ ہے کہ طبقاتی تقسیم کی ابتداء کس طرح ہو۔ اس میں ہر ایک کو اس کے درجہ پر قائم رکھنا بڑا دشوار مرحلہ ہے کیونکہ افلاطون انتخاب پر تمام امور کا دارومدار قرار دیتا ہے، وصی ہونے کے لئے ایک ہوشیار اور فہیم و ذکی لڑکا انتخاب کیا جائے، اس کی خاص تربیت

کی جائے پھر ایک دوسرے لڑکے کا انتخاب کیا جائے جو جسمانی ریاضت کی طرف بالطبع مائل ہو اور اس میں قوت و شجاعت کے جملہ مظاہر و علامات پائے جائیں، اس کے بعد وہ جنگجو طبقہ کے لئے انتخاب کر لیا جائے گا کاشتکار اور پیشہ ور اشخاص کی تعداد تو بہت ہے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کیا وسائل ہیں جن کو افلاطون نے اس نظام کو برقرار رکھنے اور اس کی دائمی بقاء کے لئے اختیار کئے؟ یہ تین ذرائع ان تین چیزوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) تولید۔

(۲) تربیت۔

(۳) روزمرہ کی ریاضت۔

مزدور کاریگر طبقہ جو زراعت اور صنعت و حرفت کے کام انجام دیتا ہے اس میں تولید مقصود نہیں ہوتی، وہ تو شادی بیاہ کرتا ہے اور اس کے نسل بھی ہوتی ہے، ان کی اولاد کی تربیت ان ہی کاشتکاروں اور پیشہ وروں کے طرز پر ہوتی ہے، اس طرح پر کہ بچہ کسی کاریگر یا کاشتکار کے پاس رہ کر صنعت و حرفت سیکھ جاتا ہے پھر اپنے پیشہ کو خود ہی مستقل طور پر انجام دینے لگتا ہے، اس کے لئے خاص روزانہ ریاضت و تربیت کی ضرورت نہیں۔

جنگجو طبقہ ایک خاص مرکز جنڈی میں زندگی بسر کرتا ہے، نہ تو اس کی کوئی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ازدواجی تعلقات، بلکہ اکثر عورتوں سے ان کا اختلاط ہوتا ہے جب وہ عورتیں حاملہ ہوتی ہیں تو بچہ کسی معروف باپ کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک جنگجو سپاہی کی حیثیت سے نشوونما پاتا ہے، اسے جنگجو طبقہ کی تربیت دی جاتی ہے، وہ کسی غیر وطنی سے محبت نہیں کرتا، اسے اپنے شہر کے علاوہ کسی دوسرے شہر کی پروا نہیں ہوتی، پھر اس لڑکے کی خاص نگرانی کے ساتھ تربیت کی جاتی ہے، اگر اس کے اندر کوئی نقص یا مرض ہو تو اس کو ہلاک کر دیا جاتا ہے، اگر اس کا بدن فنون جنگ کے ساتھ موافقت کرے تو اس کی حفاظت کی جاتی ہے، اس کے ذہن اور جسم کو تقویت بہم پہنچانے والی خاص ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔

یہی حال طبقہ اوصیا کا ہے کہ وہ بلا کسی تعین کے عورتوں سے میل جول پیدا کر لیتے ہیں، نہ تو مرد عورت کو پہچانتا ہے، نہ عورت مرد کو، اس طرح سے نسب کو ضائع کر دیا جاتا ہے کہ بچہ ماں باپ میں سے کسی کو نہیں پہچان سکتا، مردوں میں علم و حکمت اور عقل و دانش میں وہی مرد بڑھکر ہے جو نسل پیدا کرنے میں قوی ہوتا ہے تاکہ اس کی اولاد بکثرت ہو اور تمام کے تمام اس کی شجاعت و عقل کی صفات کے وارث ہو جائیں

افلاطون کا نظریہ یہ تھا کہ جو شخص جمہوریت کی خدمت ادا کرتا ہے اس کے تفوق و منزلت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اس کو بہ نسبت اوروں کے زیادہ عورتوں سے صحبت و مجامعت کرنے کا حق دیا جائے لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ اس سے افلاطون کا مقصد کیا ہے یا تو یہ وصی کے لئے حسن مکافات کے طور پر ہے کہ وہ جمہوریت کی خدمت کے اہم فرائض انجام دیتا ہے یا یہ غرض ہے کہ نسل میں زیادتی ہو کیونکہ یہ جلیل القدر خدمت جلالت عقل و تفوق دانش کی دلیل ہے۔

لیکن افلاطون طبقات کے لئے جنسی اختلاط کو جائز قرار نہیں دیتا اس کے نزدیک ہر طبقہ کے لئے عورتیں مخصوص ہیں، اس کے افراد کسی دوسرے طبقہ کی عورتوں سے میل جول پیدا نہیں کر سکتے۔ اس سے شاید اس کی یہی غرض ہو گی کہ ہر طبقہ کی ایک خاص نسل ہونی چاہیئے جس کے صفات بھی خاص ہوں جیسا کہ ہم نے اوپر اس کی توضیح کی ہے کہ ایک اسپارٹی مزاج کو کمزوری اور مرض سے نفرت ہوتی ہے! افلاطون کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جتنے لاغر اور کمزور بچے ہیں وہ تمام قتل کر دیئے جائیں اور پیشہ ور اور مزدور طبقہ کے بچوں کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی جائے تاکہ وہ زمین کے کشت زاروں پر نہ چھا جائیں۔

وہی یونانی تربیت جو افلاطون کے زمانہ میں مشہور و معروف

تھی اُس کے قائم کردہ نظام کے ماتحت ادمیاء کو بھی دی جاتی تھی چونکہ ادمیاء کا کوئی خاندان نہیں ہوتا اس لئے مربیوں کے ذمہ اُن کی اولاد کو سپرد کر دیا جاتا تھا یہ بچپن ہی سے اُن کے جسموں کو جمناسٹک کے کھیلوں اور ورزشوں کے ذریعہ اور اُن کے اذہان و قلوب کو موسیقی کے ذریعہ سے تربیت کرتے پھر کھیل تماشہ کے طور پر بچہ کو مختلف علوم و فنون کی اس طرح تلقین و تفہیم کی جاتی کہ یہ شعور تک نہیں ہوتا کہ اُس کو تعلیم کی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے وہ ہنسی خوشی کھیلتے ہوئے علم حاصل کر لیتا ہے جب وہ جوان ہوتا ہے تو اُس کی تعلیم کا علیحدہ نظام اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جاتا ہے پھر کسی وقت تمام نوجوانوں کا امتحان لیا جاتا ہے اس کے بعد طبقہ ادمیاء میں سے وہی لوگ شریک کئے جاتے جو اُس کی آزمائش میں پورے اُترتے کیونکہ شہر کی حکومت کے یہی اہل ہو سکتے ہیں۔ ادمیاء مرکز جندی کے حاشل مقام میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ اس امر کے مجاز نہیں ہیں کہ کوئی گھر تعمیر کریں یا خزانہ جمع رکھیں اور اُن کے لئے یہ کسی طرح سزاوار نہیں کہ سوائے اُن چند ضروریات کے جو انسان کو درپیش ہوتی ہیں کسی چیز کے مالک ہو سکیں اُن کو ایک معتدل وظیفہ یا معاوضہ دیا جائے گا جو اُن کی حاجتوں اور ضرورتوں کا کفیل ہو سکے بایں طور کہ وہ فاقہ و افلاس کی تنگی کو محسوس نہ کریں اور انتہائی عیش و عشرت کی بھی کوئی سبیل نہ پیدا کریں وہ تمام کے ساتھ ملکر کھائیں وہ سونا چاندی میں سے کچھ بھی نہیں لے سکتے۔

اس نظام سے مقصد صرف یہ ہے کہ وصی صاف ستھری زندگی گزارے کوئی خاص مشغلہ اس کو شہر کی تدبیروں میں غور و فکر کرنے سے باز نہ رکھے کسی خاص مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے اس کی رائے محکم اور اٹل فیصلہ صادر کرنے میں نہ بدل جائے اس سے محبت کرنے کے لئے اس کا کوئی رشتہ دار نہیں، مال جمع کرنے کے لئے اس کی کوئی اولاد نہیں، اس طرح وہ سوائے اپنے طبقہ کے لوگوں کے کسی دوسرے سے میل جول پیدا نہیں کرسکتا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دوستی اور معاشرت اس کے امور میں اثر انداز ہو کر اس کی صفائی ذہن کو مکدر اور فکر و نظر کی روشنی کو دھندلی کر دے۔

اوصیاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی جوانی کے عالم میں جنگجو طبقہ سے ہوں، اپنا وقت جسموں اور عقلوں کی صفائی اور ذہن و فکر کی پاکیزگی میں صرف کریں، جب وہ پچیس سال کی عمر تک پہنچ جائیں تو بعض لشکروں کی سرداری کے عہدہ پر انہیں فائز کیا جائے تاکہ یہ تجربہ حاصل کرکے قوی و جری ہو جائیں، جب وہ تیس ۳۰ سال کے ہو جائیں اور سخت امتحانات کو عبور کر جائیں تب وہ اوصیاء کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، اس وقت ان کا کام محض یہ ہوگا کہ وہ فلسفہ و حکمت کا درس دیتے رہیں اور سلطنت کے نظام اور اس کے قوانین وضع کرنے کے فرائض انجام دیں۔

اوصیاء کا کام قوانین کا اجراء ہی نہیں بلکہ حکومت کا نظام بھی اختراع

کرنا یا افراد کی آزادی کے لئے شہر کے دستور کو وضع کرنا ہے چنانچہ سب سے جراوت آفریں اور اہم کام وہ حریت ہے جس کا افلاطون اہتمام کرتا ہے اور اُس پر سب سے زیادہ توجہ خرچ کرنے پر زور دیتا ہے اس لئے وہ اس کی نگرانی و حفاظت کو ان اوصیاء کے سپرد کرتا ہے جن پر مفید نظام اور بہترین قوانین اختراع کرنا واجب ہے جو لوگ افلاطون کے شہر میں احکام و اوامر پر چلنے والے ہوتے ہیں اُن کے لئے دستور اور قانون وضع کرنے والے اوصیاءُ ہوتے ہیں خواہ وہ لوگ مزدور پیشہ یا کاریگر گروہ کے ہوں یا جنگجو طبقہ کے اوصیاءُ حکام کے قائم مقام ہیں جب وہ دیکھیں کہ مثلاً طبقہ عمال کے لئے جو دستور اور قانون وضع کیا گیا ہے اُن کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا ہے تو اُس کو بدل ڈالیں اور اُس کی جگہ کوئی مفید دستور ایجاد کریں۔

قارئین یہاں یہ شبہ نہ کریں کہ افلاطون نے جنگجو اور اوصیاء کے طبقہ کو ملکیت و ازدواجی تعلقات کے حقوق سے محروم رکھنے کا جو تخیل پیش کیا، وہ محض خیالی چیز ہے یہ ایک حد تک درست ہے لیکن ہم یہاں اس چیز کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ مسیحی رہبانیت اور بالخصوص عیسائیوں کا بعض نظام اس قسم کا ہے جو تقریباً افلاطون کے پیش کردہ نظام کے لگ بھگ ہے ایک راہب بھی ازدواج یا کسی اور چیز کا مالک نہیں بن سکتا اس سے یہ نظام کامیاب رہا جب ایک انسان کے لئے دین و مذہب کی

اپنی ذات و وجود کو مٹا دینا اپنے طبعی رُجحانات اور جنسی میلانات کو قربان کرنا اور ملکیت کے جذبہ کو فنا کر دینا آسان ہے تو کیا یہ تمام چیزیں بنی نوع اِنسان کی راہ میں قربان کرنا آسان نہیں جب اِنسانوں میں ایسے گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی زندگی کو خدمت حق میں وقف کر دیتے ہیں. خود کو گھروں کی چار دیواری میں نظر بند کر لیتے اور عمر بھر گھر کے تاریک گوشوں سے باہر نہیں نکلتے دن رات زہد و عبادت میں گزار دیتے ہیں تو کیا ان میں ایسے اشخاص کی بھی ضرورت نہیں جو یہ تمام اوقات فلسفہ و حکمت کا درس دینے حکومتوں کا نظام ایجاد کرنے اور بنی نوع اِنسان کو حرّیت اور نجات دِلانے کے لئے صرف کریں۔

اِس لئے اَب ہمارا خوشگوار فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اِس شبہ کو دور کریں کہ افلاطون نے محض تصوری اور خیالی چیز پیش کی ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ حکومت کی باگ فلاسفہ کے ہاتھ میں دیدی جائے. اُس کا نظریہ بھی وہی ہے جو اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا کہ بچہ اپنے باپ کے لئے بزدلی اور بخالت کا ذریعہ ہے افلاطون نے اِس سبب کو ازدواج میں پایا تو مہرے سے اُس کو باطل کر دیا اِس آرزو پر کہ وصی یا جنگجو شخص خوشگوار زندگی گذارے اس کا ہر کام اور غور و فکر شہر کی مصلحت اور مملکت کے فائدہ میں صرف ہو۔

اُوپر ہم نے رہبانیت کو اِس امر پر دلیل ٹھرائی تھی کہ اس کے ذریعہ سے اِنسانی طبیعت اِزدواج اور ملکیت سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ نہیں ہوتی چنانچہ ترکوں کا جیش اِنکشاریہ اِس بات کا بین ثبوت ہے کہ خاندانی تعلقات مردوں کی شجاعت کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ یہ لشکر نصاریٰ کے ان بچّوں سے مرکب تھا جو قید کر لئے جاتے تھے وہ ایسے ماحول میں تربیت پاتے جہاں وہ یہ نہیں جانتے کہ اُن کا خاندان کوئی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ بہادر اور جنگجو ہوتے ہیں میدانِ جنگ میں نہایت پامردی اور شجاعت سے مقابلہ کرتے ہیں ۔

طامس مور کا خواب

(سن ولادت ۱۴۷۸ء۔ سن وفات ۱۵۳۵ء)

یونانی ادب پر مُردنی چھا جانے کے بعد تمام فضائے عالم میں ذہنی و فکری آزادی کا جذبہ فنا ہوگیا مگر اس میں سے چند شرارے عربوں کی خاک میں دَبے رہے جو گردوپیش کے انقلابات اور حوادثِ زمانہ کے نرم و تند جھونکوں کے ساتھ بھڑکتے رہے۔ اہلِ یونان اپنے خیالات میں بہت آزاد اور بحث و تخمین میں نہایت جری تھے۔ اُن کو خداؤں اور انسانوں کی ذرا بھر پرَوا نہیں ہوتی تھی کیونکہ دیوتاؤں اور انسانوں اِن دونوں کا اِتنا تسلّط و اقتدار نہیں تھا جتنا کہ بعد میں یعنی مسیحیت، شہنشاہیت اور ملوکیت کے ظاہر ہونے کے بعد اُن کو حاصل ہوا یونانی دیوتاؤں کی تعداد بے شمار تھی، اُن میں ہر دیوتا ایک خاص مقصد اور عمل کے لئے مخصوص تھا۔

اس کے لئے وہ مرتبہ اور اقتدار و احترام نہیں تھا جو مسیحی یا اسلامی خدا کے لئے ہے اور نیز اس پر یہ ضروری نہیں کہ اس کے لئے ہر چیز کا علم ہو اور وہ لوگوں کی تمام مرادیں بر لائے جیسا کہ یہ صفات ایک مسیحی یا اسلامی الوہیت کے مظہر میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح یونانیوں پر استبداد پسند سلاطین و اُمراء مسلط نہیں تھے جو لوگوں کو حکومتوں کی تشکیل، ملکوں کی سیاست اور سلطنت کے اصول و قوانین میں غور و فکر کرنے سے باز رکھتے ہوں۔

چوں کہ یونانیوں میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی تھی، اس لئے وہ اپنے افکار و خیالات کو لوگوں کے روبرو نہایت بے باکی اور آزادی کے ساتھ پیش کر دیا کرتے تھے، یونانی فلاسفہ ان تمام نظریات و خیالات کو جو اُن کے دل و دماغ میں گزرتے بلا خوف و خطر نکھرا اُن کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔ ان کو نہ تو دین و مذہب کی کچھ پروا ہوتی اور نہ بادشاہوں کا خوف —— پھر جب مسیحی دیوتا تمام چیزوں پر قادر اور ہر چیز کو جاننے والا ہوا تو سلطنت و حکومت کی زمام انسان کے قبضہ سے نکل کر اللہ کے ہاتھوں میں اور پھر اس عالم سے دوسرے عالم میں چلی گئی ایک طرف اگر افلاطون نے ایک ایسی سلطنت ارضی کو جہاں لوگ سعادتمندی اور خوش حالی کی زندگی بسر کریں ایجاد کرنے کا خواب دیکھنے کے لئے اس قدر وسیع جولاں گاہ پائی تو دوسری طرف مسیحیت نے اس وسیع میدان کو

نہایت تنگ کر دیا کیونکہ اس نے اُن رنگین خوابوں کے عوض میں جنت النعیم کو ایجاد کیا۔ مسیحیت کی نظر میں یہ دنیا محض آزمائش اور تجربات کا گھر ہے جہاں سے عبور کر کے لوگ جنت النعیم کی طرف جاتے ہیں یہی نظریہ اسلام کا بھی ہے۔

مسیحی سلاطین اور اسلامی خلفاء سوسائٹیوں اور حکومتوں کی انتہائی تشکیل میں بحث و نظر کرنے سے روکتے تھے کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ ان پہلوؤں پر بحث و تحیص موجودہ نظام کو درہم برہم کرنے کی دلیل ہے جس کے لئے کوئی بادشاہ یا خلیفہ تیار نہیں۔

پھر جب یورپ کا ارتقائی دور شروع ہوا تو یورپ اپنے اسی قدیم طرز کی طرف رجوع ہوا اور یونان کی تاریخ کی طرف اپنی عنان توجہ پھیرنے لگا یونانیوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کے تمدن و عمران کے سبق دینا شروع کیا اور ان کو بطور تمثیل منظر عام پر ظاہر کرنے لگا یہاں تک کہ وہ جدید یونانی لباس میں ملبوس نظر آنے لگا اس کے علماء و فلاسفہ پیشین گوئیاں کرنے تخیل و نظریہ پیش کرنے اور رنگین خواب دیکھنے لگے۔

انہی خواب دیکھنے والوں میں سے سر طامس مور انگلستانی ہے جو ہنری ہشتم کا وزیر تھا در حقیقت اس کا خواب محض خیالی بنیادوں پر قائم نہ تھا اس نے حکومتوں کے متعلق پیشین گوئی کی۔ سیاسی میدان میں اپنے طویل تجربے اور دانائی سے

بعض انسانی طبائع کے حقائق کا انکشاف کیا اُس کا تخیل ایسے ہی اُمور کے بارے میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے تخیلات کو حقائق کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔

میدانِ خواب کا شہسوار ایک پرتگالی شخص جو ہٹلوڈائی سے مشہور ہے یونانی زبان سے واقف تھا اُس زبان کے فلاسفہ کے ذریعہ سے حریت افکار بن چکا تھا یہ شخص محض مصنف ہی نہیں تھا بلکہ اس نے ایک شخص فسبوتیوس سے تعارف پیدا کیا اُس کے ساتھ شمالی وجنوبی امریکہ اور مشرقی جزائر الہند کی سیاحت کی۔ اس نے وہاں ایسے شہر دیکھے جو اس کی اس تالیف کے مخالف پڑتے تھے جس کو اپنے شہروں کے متعلق سوسائٹی کی تشکیل و ترکیب، حکومت کے نظام اور اساسی قوانین کے بارے میں لکھی تھی اِس لئے وہ اپنے خوابوں کے حالات و مناظر پیش کرتا ہے شاید پڑھنے والوں کے لئے یہ مفید و کارآمد ہوں۔

ہٹلوڈائی کہتا ہے کہ وہ ایک جزیرہ میں گیا جو دو سو میل لمبا تھا محیط کے وسط میں چند ہلالی شکل کے خط کھینچے گئے تھے جو خلیج اعظم کے اِرد گرد اِس طرح گھیرے ہوئے تھے جن سے دشمن کے حملوں کی آسانی کے ساتھ مدافعت کی جا سکتی ہے اِس جزیرہ میں ۵۴ شہر تھے ان میں سب سے نزدیک کے شہر دور کے شہروں سے تقریباً ۲۴ میل کے فاصلہ پر تھے اور سب سے دور کے شہروں کے درمیاں ایک دن کی مسافت کا فاصلہ تھا جزیرہ کا پایہ تخت اموروط کہلاتا تھا۔

اِس ملک میں زندگی کا سارا دارومدار زراعت پر تھا یہاں کا ہر شخص اِس

پیشہ سے واقف تھا یہاں ایسے کاشتکار رہتے تھے جو اپنی زندگی کھیتوں میں گذار دیتے تھے ان کی بستیاں اور گاؤں کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن فصل کاٹنے کے وقت کسانوں کو مدد بہم پہنچانے کے لئے شہر سے مزدور بھیجے جاتے ہیں۔ ہر قریہ چالیس مردوں اور چالیس عورتوں پر مشتمل ہے۔ ہر سال اُن میں سے بیس کی تعداد میں شہر لوٹا دئے جاتے ہیں اور اُن کی بجائے دوسرے بیس اشخاص شہر سے قریہ میں اس غرض سے بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ یہاں رہ کر کاشتکاری سیکھیں۔ غرض کہ زراعت اقتصادی و انتاجی دونوں حیثیت سے بیش بیش ہے۔ یہ [illegible] اور مصنوعی طریقہ سے مرغیوں سے بچے پیدا کرنے کی کیفیت سے بھی واقف ہیں اور وہ اس چیز کو بھی جانتے ہیں کہ اہل جزیرہ کے لئے کس قدر خوراک کی ضرورت ہے چنانچہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب کفایت زراعت کرتے ہیں۔

باوجودے کہ تمام باشندگان جزیرہ کاشتکاری سے واقف ہیں اور اس کے اندر انھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ صرف کرکے تجربہ حاصل کیا ہے لیکن پھر بھی وہ تمام دوسری صنعتوں مثلاً تعمیر، نجاری، حدادی، دستکاری وغیرہ سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اور ان کی ہمیشہ مشق کرتے رہتے ہیں۔ تمام صنعتیں بلحاظ قدر و قیمت مساوی درجہ رکھتی ہیں۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ لوگ اِن صنعتوں میں اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صناعت افراد میں نہیں بلکہ کئی خاندانوں میں ہوتی ہے۔ جو اس کی مشق کرتے ہیں، جس کا میلان

ایسی صنعت کی طرف ہو، جو اس کے باپ کی اختیار کردہ صنعت کے مخالف ہے تو وہ دوسرے خاندان میں چلا جاتا ہے، جہاں وہ خاندان اس کو اپنا متبنیٰ قرار دے لیتا اور اسے اپنی صناعت سکھاتا ہے۔ پھر اگر وہ چاہے تو اس اختیار کردہ طریقہ کے ساتھ ساتھ دوسری صنعت بھی سیکھ سکتا ہے ان دونوں میں سے جو طریقہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

یہاں کے قاضیوں کا کام تقریباً یہ ہے کہ وہ لوگوں کو زبردستی کام کرنے پر مجبور کریں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہل جزیرہ دن رات محنت، مشقت اُٹھاتے رہتے ہیں، بلکہ اُن کے کام کرنے اور راحت و آرام کرنے کے اوقات مقرر ہیں، وہ آٹھ گھنٹے سوتے چھ گھنٹے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں اور باقی دن کے اوقات اپنی مرضی کے مطابق گزارتے ہیں، وہ اس قدر مختصر اوقات تک اس لئے کام کرتے ہیں کیونکہ ہر انسان کام کرنے پر مجبور ہے، ان میں کوئی امیر ہے نہ شریف تاکہ وہ بہ نسبت اوروں کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکے، اس قانون سے سوائے مدرسہ کے طالب علموں اور قاضیوں کے اور کوئی مستثنیٰ نہیں۔

شہر اور قریہ کے درمیان مبادلۂ اجناس کے لئے مہینہ میں ایک مرتبہ مجمع عام ہوتا کہ کسان شہریوں کی صنعتوں کو اور اہل شہر دیہاتیوں کے غلوں کو اپنی حسب ضروریات حاصل کر سکیں، اس مجمع عام کے لئے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے،

لیکن ہٹلوڈای نے اس نظام کا ذکر نہیں کیا۔

شہر کئی خاندانوں سے ترکیب پاتا ہے اور صناعت جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے خاندان میں ہوا کرتی ہے۔ ہٹلوڈائی کہتا ہے کہ " ہر شہر چار حصوں میں منقسم ہے، ہر حصہ کے درمیان ایک بازار ہے، قبیلے اپنی جو مصنوعات پیش کرتے ہیں ان کو لے لیا جاتا ہے اور ہر ایک صنعت کو اس کی نوعیت کے اعتبار سے خاص خاص مقامات پر قرینہ سے رکھا جاتا ہے پھر ان خاندانوں کے سرپرست اور مربی یہاں آتے ہیں اور ان چیزوں میں سے اپنی ضروریات کے مطابق ان کی قیمت دیئے بغیر یا کوئی چیز معاوضے میں رکھے بغیر مقایضہ کے طور پر لے لیتے ہیں، یہاں پر کوئی شخص کسی کو اس کی مطلوبہ چیز دینے سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ یہاں موجودہ چیزیں وافر مقدار میں ہیں اور اس کا خوف بھی نہیں کہ کوئی شخص اپنی حاجت سے زیادہ لے لیگا کیوں کہ اس کو ورغلانے والی یہاں کوئی چیز نہیں، اس لئے کہ اُس کو ایسی چیزیں ہمیشہ پیدا کرنی پڑتی ہیں۔"

پھر وہ کہتا ہے کہ " ضرورت وحاجت کا خوف ہی حیوانوں کے اندر حرص و آز کے جذبات پیدا کرتا ہے لیکن ہم خوف کے پس پردہ انسان کے پاس ایک اور خصلت کا معائنہ کرتے ہیں اور وہ خودداری اور کبریا ہے اس حیثیت سے انسان یہ گمان کرتا ہے کہ دوسروں پر اپنا تکبر جتلانے میں فوقیت لے جانا اس کے مجد و شرف اور عظمت کو زیادہ کرتا ہے لیکن اس

جزیرہ میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس فعل کا ارتکاب کرنے کی جراءت کر سکے۔"

افلاطون کی طرح طامس مور عورتوں کی اشتراکیت کا خواب نہیں دیکھتا ہے بلکہ یہ ملکیت کے اشتراک کا خواب دیکھتا ہے محض اس لئے کہ اس اشتراکیت کے ذریعہ سے نقد و سرمایہ داری کے سلسلہ کو باطل کر دیا جائے اور لوگ اپنی ضرورتوں کو قیمت ادا کئے بغیر پوری کر سکیں۔

ہر سال شہر "اموروط" میں قضاۃ جو حکام بھی وہی ہیں جمع ہوتے ہیں ہر گاؤں اور دیہات کے غلوں کا معائنہ کرتے ہیں اور جن قریوں اور بستیوں میں ان کی ضرورت ہوتی ہے بھیج دیتے ہیں۔

اہل جزیرہ کے پاس چاندی، سونے اور جواہر کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس لئے طامس مور کا یہ خواب یوحنا کے خواب پر جو آرائش و زینت کی حیثیت رکھتا ہے قیاس نہیں کیا جا سکتا، حالانکہ پہلے خواب کی تعبیر کا مقصد اس عالم میں ہے اور دوسرے خواب کی تعبیر آسمان ہی میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ یہ عجیب و غریب چیز ہے کہ ایک دنیا دار آدمی ایسے ملکوت کی طرف جو زیب و آرائش اور جواہر سے خالی ہو عین اس وقت دعوت دے جب کہ ایک مذہب پرست انسان آسمانی حکومت کی طرف بلاتا ہو۔ اموروط جزیرہ کا پایۂ تخت ہے جو ایک بلندی پر واقع ہے، اس کے اطراف دیواریں ہیں، یہاں کی عمارتیں مضبوط

اور ایک ہی نظام اور طرز پر بنائی گئی ہیں گویا سڑک ایک سلسلہ وار عمارت معلوم ہوتی ہے۔ سڑک کی وسعت بیس قدم کی ہے ہر عمارت کے پچھلے حصہ میں ایک باغ ہے یہاں کے رہنے والے اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ سڑک پر چند خاص عمارتیں ہیں جو مساوی مسافتوں پر تعمیر کی گئی ہیں جہاں قضاۃ رہتے ہیں ہر قاضی تیس قبیلوں کی نگرانی اور سرپرستی کرتا ہے ان میں سے نصف تو سڑک کے ایک کنارے اور نصف دوسرے کنارے پر ہیں۔

انہی وسیع عمارتوں میں تمام باشندے اپنی غذا کھاتے ہیں اور کھانا پکانے کے لئے تیس قبیلوں کی عورتیں باری باری سے مقرر ہوتی ہیں اس منزل کے ایک طرف عبادت گاہ ہے دوسری طرف ان عورتوں کے بچوں کے کھیل تماشا کا میدان ہے جو اپنی باری میں کھانا پکانے کے لئے اپنے ساتھ لایا کرتی ہیں۔

حکومت :- اس جزیرے کی حکومت اس طور پر ہے کہ خاندان ہی سوسائٹی کی اصل بنیاد ہے۔ ہر تیس قبیلے ہر سال اپنے لئے ایک قاضی کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہر دس قاضیوں کا ایک افسر ہوتا ہے اور تمام جزیرہ کے قضاۃ جن کی تعداد دو سو تک ہے اپنے لئے ایک امیر کا انتخاب کرتے ہیں اس کی امارت اس کی عمر بھر کے لئے اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ اس الزام میں نہ مبتلا

ہو جائے کہ باشندوں کو وہ غلام بنانا چاہتا ہے نظام حکومت کو ایسر یا دوسروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے تمام رپورٹ سارے باشندگان جزیرہ کو سنائی جاتی ہے، قاضی سب سے پہلے اس روئداد کو اپنے مخصوص تیس قبیلوں میں پیش کرتا ہے، وہ لوگ اس میں بحث و نظر کرتے ہیں اور جو چیز طے پاتی ہے اس کو قاضی مجلس شیوخ (پارلیمنٹ) میں پیش کرتا ہے۔

خاندان جیسا کہ میں نے دیکھا ہے محض وحدت بیتہ سے عبارت نہیں بلکہ وہ وحدت صناعیہ بھی ہے، جب انتخاب کے لئے کوئی قاعدہ بنتا ہے تو اس میں حکومت کا جمہوری نظام بھی شامل ہوتا ہے جس سے اس کی بقاء کا دامن وابستہ ہے۔

لیکن اس خواب میں بعض ایسی چیزیں قابل تحقیق و تنقید ہیں جن میں طامس مور اپنے خاندانی حدود سے نکل نہ سکا اس نے اس امر کا احساس و ادراک نہیں کیا کہ مثلاً باشندگان جزیرہ کی آبادی میں روز افزوں زیادتی باوجود غذاء و افراد باشندوں کی صحت و تندرستی پر توجہ صرف کرنے کے لازمی طور پر یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ یہاں کے باشندے اپنی خوراک پر غالب ہو جائیں گے اور دوسرے اشخاص میں فاقہ و افلاس کو ایجاد کرنے کا باعث ہوں گے۔ طامس مور اپنی اس غلطی میں معذور ہے کیونکہ اس کے زمانے میں اموات بکثرت وقوع پذیر ہوتی تھیں جو پیداوار کے مساوی

تھیں، پس اعلیٰ سوسائٹی کے افراد کو محدود کرنے کا تخیل کسی کے ذہن میں گذرنے نہ پایا اگرچہ افلاطون نے اپنے ذہن وفکر کی روشنی میں اس احتمال کو پا لیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اولاد کی کثیر پیداوار کے سیلاب کو روکنے اور حد بندی کرنے کی وصیت کیا کرتا تھا۔

طامس مور نے دیگر مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ شخص بھی اُس حد تک ترقی نہیں کر سکتا جہاں تک ہم اپنے تصور میں سمجھ سکتے ہیں اس سے بالخصوص مسئلہ جنگ اور باشندوں کے مسئلہ نقل وحرکت (ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال) پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحرکت کرنے کے مسئلہ میں امیر جزیرہ سے اجازت لینا ضروری ہے اگر کوئی فرد ایک دن سے زیادہ کسی مقام میں ٹھہرنا چاہتا ہے تو اس کو اسی مقام پر جہاں وہ منتقل ہوا ہے اپنی صنعت کا سلسلہ جاری رکھنا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کسی دوسری جگہ جائے تو اُس کو سزا دی جائے گی اگر دوبارہ اسی فعل کا مرتکب ہوا تو اس سے غلاموں کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔

طامس مور نے اس مسئلہ کا جو حل پیش کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس میں گہری توجہ اور وسیع غور ونظر سے کام نہیں لیا یا یہ کہ

اُس نے غلاموں کو اپنے جزیرہ کے لئے ملکیت بنانا چاہا کیوں کہ اس نے دیکھا کہ بعض وہ کام جن کے لوگ محتاج ہوتے ہیں ایسے ہیں کہ طبعی طور پر ان میں جبر و اکراہ پایا جاتا ہے کوئی شخص اپنی مرضی و طبیعت سے ان کو ہمیشہ اختیار کرنا پسند نہیں کرتا مثلاً جانوروں کو ذبح کرنا اور سڑکوں کی پاکی صفائی وغیرہ کو انجام دینے کے لئے غلاموں کو مخصوص کیا اور کمزور اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے سوسائٹی کے نظام میں غلامی کی بنیاد ڈالی تاکہ اُس کے افراد اپنی طبعی مجبوریوں سے الگ ہو کر راحت کی زندگی بسر کریں۔ لیکن اس نے تصویر کے دوسرے رُخ کو فراموش کر دیا وہ یہ کہ غلاموں کی معاشرت سرداروں اور آقاؤں میں اثر انداز ہوتی ہے جب ایک آقا اپنے غلام کے حق میں جور و استبداد سے کام لے گا تو امیر بھی اپنے آقا کے حق میں جو اُس کے ماتحت ہے استبداد پسند واقع ہوگا اس طرح سے استبدادیت کی زنجیریں مضبوط اور مسلسل ہوتی جائیں گی۔

جنگ چند شروط و قیود کے ساتھ جائز ہو سکتی ہے وہ یہ ہیں کہ ملک کی مدافعت ملحوظ ہو، غیر اقوام تجارت پیشہ لوگوں کو تکلیف دیں، قوموں کو ان شہروں کی جانب ہجرت کرنے سے روک دیا جائے، جہاں کی زمین میں زراعت کی قابلیت ہو اور جہاں زراعت کرنے والے نہ ہوں۔

اِن شروط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طامس مور ان حوادث و

اِنقلابات سے متاثر ہوکر یہ نظریات پیش کر رہا ہے جو اُس کے زمانے میں واقع ہوئے امریکہ میں اِکتشافات وایجادات کا نیا دور تھا یہاں ہجرت کرنے کا سلسلہ لگا ہوا تھا۔ تجارتی کشتیوں کو بندرگاہوں پر ٹھرا کر ان کے مال واسباب کو لوٹ لیا جاتا تھا۔

لیکن طامس مور لشکر کو "یوجینہ" کے طریقہ پر مرکب کرتا ہے وہ جنگ جو لشکر میں برے لوگوں کا اِنتخاب کرتا ہے تاکہ اُن کے فنا ہو جانے کے بعد قوم کو ایسا فائدہ پہنچے جیسا کہ ایک کسان اپنے کھیت سے خس وخاشاک کو جو پیداوار میں ضرر رساں ہوتے ہیں اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔

اَب دیکھنا یہ ہے کہ مذہب اور زواج کے لئے کیا شروط ہیں؟ اِس جزیرہ کے لوگ شادی کے پہلے مرد وعورت ہر دو کو عریاں دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ طلاق کے لئے دو علتوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) زنا۔

(۲) میاں بیوی کے درمیان ایسے فساد کا پیدا ہو جانا جس کی اِصلاح ناممکن ہو۔ جو شخص زنا کرے تو اس کو غلاموں کے دائرہ میں شریک کر دیا جائے گا اِس کے بعد مرد یا عورت کسی کو بھی نکاح کی اِجازت نہ ہوگی۔

طامس مور کا یہ وہ خواب ہے جس میں بظاہر دیکھنے والے کے لئے کوئی اچھوتا خیال اور جدید نظریہ معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے ان تمام

نظریات واحساسات کے پردہ میں ایک ہی تخیل اور نظریہ کارفرما ہے وہ یہ کہ
اِنسان تمام اِملاک پر مسلط ہو کر اس سے خود بھی فائدہ حاصل کرے اوروں
کو بھی نفع پہنچائے نہ یہ کہ خود وہی سرمایہ پرست بن جائے۔ عمر بھر خزانہ
جمع کرکے جن اور بھوت کی طرح اس پر قابض رہے اور اس کی حفاظت
میں جدوجہد صرف کرے اور یہ گمان کر بیٹھے کہ وہی اس کا مالک ہے
درحقیقت سرمایہ داری اس کو غلام بنا کر اس پر حکومت کرتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ طامس مور نے نقود کے سلسلہ کو ایک دم قطع کر دیا
کیونکہ یہ سرمایہ پرستی اور خزانہ جمع کرنے کا وسیلہ ہے وہ تمام پر زراعت
کو واجب قرار دیتا ہے خواہ اُس کے لئے تھوڑا ہی وقت کیوں نہ
ملے یہاں تک کہ ہر انسان کو اِس بات کا شعور ہو جائے کہ وہ اپنی
محنت کا پھل حاصل کر رہا ہے اگر کوئی انسان زراعت نہیں کرتا ہے
تو اس پر کوئی نہ کوئی صنعت ضروری ہے۔ پھر اپنی تمام مصنوعات
لوگوں کے سامنے پیش کرے تاکہ حسب ضرورت وہ اُن میں سے حاصل
کریں اور یہ اندیشہ نہ کرے کہ اُن میں سے کوئی ضرورت سے بڑھ کر
لے لیگا اور جمع کر رکھے گا۔

فرصت و فراغت کے اوقات بہت زیادہ ہیں۔ اُن کو علوم
و فنون حاصل کرنے میں صرف کرنا چاہیئے۔ ہر انسان کا نصب العین

یہ ہو کہ علم کے ذریعہ سے اپنے فکر و ضمیر کی تربیت کرے یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مفید بحث و مذاکرہ سے ارتقاء کے اعلیٰ مدارج طے کرے ——— !!

اِندریا کا خواب

(ولادت ۱۵۸۶ء - وفات ۱۶۵۴ء)

یُوحنا فالنتین اِندریا جرمنی ہونے کے ساتھ ساتھ مسیحی بھی ہے۔ اس کا خواب "مسیحی تمدن" کی تحقیق میں ہے جیسا کہ ایک معمولی شخص اُس کی دیانت سے گمان کر سکتا ہے۔ لیکن اِندریا بسا اوقات تمام مذہب پرست اِنسانوں کی طرح اپنے خواب سے بھی زیادہ اُونچے مقام پر پہونچ جاتا ہے اس پر دینی وعظ کا رنگ غالب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے وعظ کے ذریعہ سے پڑھنے والے کو اس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں تک وہ پہنچا ہے۔

وہ خواب اپنے ایک بحری سفر سے شروع کرتا ہے جہاں اس کی کشتی ایک جزیرہ کی چٹان سے جو اُس کے خواب کا مقام ہے ٹکرا کر پاش پاش

ہو جاتی ہے اِس جزیرہ میں "کرستیا نو بولیس" یا ایک مسیحی شہر تھا۔ جب اُس نے اُس کے اندر، داخل ہونا چاہا تو پہلے یہاں کے باشندوں نے اَخلاق و فضائل اور تہذیب و شائستگی میں اُس کا اِمتحان لیا، جب اُن کو ہر طرح تشفی ہو گئی تو داخل ہونے کی اِجازت دے دی۔

شہر کے اوصاف یہ تھے۔ یہ شہر مربع شکل کا تھا جس کا طول سات سو فیٹ چار برجوں اور دیواروں میں محصور تھا۔ مکانات دو قطاروں میں تھے ان میں صرف ایک راستہ اور ایک بازار تھا جو قدیم طرز کا تھا۔ شہر کے درمیان ایک مستدیر عبادت گاہ تھی جس کا قطر ۲۰۰ سو فیٹ تھا۔

شہر کے اوصاف عامہ یہ تھے۔ تمام مکانات باہم مشابہ تھے۔ کوڑا کرکٹ سے بالکل پاک۔ تمام گھروں کے اندر پاک وصاف ہوا سرگوشیاں کرتی تھی، اِس شہر میں چار سو اشخاص دینی اَمن و سلامتی کے سایہ میں خوش گوار زندگی بسر کرتے تھے۔ تمام جزیرہ زراعت اور مختلف کارخانوں کے لئے مخصوص تھا۔

مسیحی شہر بلحاظ صناعات تین حصوں میں منقسم تھا۔

(۱) خفیف مصنوعات کے لئے جن میں آگ کی حاجت نہیں۔

(۲) ان مصنوعات کے لئے جن میں بار بار آگ روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ آگ ہمیشہ روشن رہتی ہے۔

(۳) حیوانوں کی تربیت اور زراعتی کاروبار کے لئے ـــــ اس تقسیم سے غرض یہ ہے کہ یہ مصنوعات شہر کے ارد گرد بلا نظم و ضبط متفرق رہنے کی صورت میں قرب و جوار کے بسنے والوں کو کسی قسم کی ایذا و تکلیف نہ پہنچائیں۔ وہ مزدور پیشہ لوگ جوان کارخانوں میں کاروبار میں مشغول رہتے ہیں چار پائیوں کی طرح سے نہ بھر جائیں بلکہ اس سے پیشتر وہ علم و فن سے آشنا ہوں اور ان کو علمی اور تحقیقی مسائل پر کافی عبور اور صحیح معرفت حاصل ہو ـــــ ایک کاریگر کے لئے اس قسم کی علمی و تحقیقی تربیت کی ضرورت میں اندریا کا نظریہ یہ ہے کہ :-

"جب تم مادہ کو تجربہ سے تجزیہ و تحلیل نہ کریں اور اپنے ناقص معلومات اور تشنہ مشاہدات کی وجہ سے اچھے اچھے آلات ایجاد نہ کر سکیں تو تم سے کسی قسم کے فائدہ کی اُمید نہیں۔"

اندریا کے خواب میں یہ عجیب و غریب مقام ہے کہ وہ صناعت کے لئے علم اور صانع کے لئے تعلیم کا قائل ہے حالانکہ ان دونوں کی غرض اَب تک تمام متمدن ملکوں میں کہیں ثابت نہیں ہوئی بلکہ بعض تو ان دونوں سے نابلد ہیں۔

صناعت کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ ان کا عمل یا اُن کی دستکاریاں جیسا کہ اُن کے پاس مشہور ہے ایک خاص نہج اور طرز پر جاری ہوتی ہیں اور

ان کی تمام مصنوعات ایک مخزن عمومی میں جمع کر دی جاتی ہیں یہاں کاریگر آتا ہے اور اِس مخزن سے آئندہ ہفتہ کے لیئے اپنی دستکاری کے لئے جس قدر ضرورت ہوتی ہے لے جاتا ہے اِس لئے کہ شہر ایک ہی کارخانہ ہے جہاں مختلف قسم کی مصنوعات تیار ہوتی ہیں جب مخزن میں مصنوعات کی ایک بڑی مقدار جمع ہو جاتی ہے تو تمام کاریگروں پر سے کام کرنے کی قید اُٹھا دی جاتی ہے اور اُن کو مطلق آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ جس چیز میں چاہیں اپنے ذہن و دماغ کو صرف کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص نقود کو لے جانے کا مجاز نہیں اُن کے پاس نقود کی کوئی حقیقت و منفعت نہیں ہے باوجود سے کہ جمہوریت کے لئے اُن کے خزانے موجود ہیں۔ اِس اعتبار سے یہاں کے باشندوں میں مساوات کا اِمتیاز پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص دوسرے سے زیادہ مالدار نہیں اُن میں محض اذہان و عقول کا اِمتیاز پایا جاتا ہے یہ اپنے اَخلاق و فضائل میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ اُن کے کام کرنے کے اَوقات بہت تھوڑے ہیں لیکن باوجود اس کے وہ بہت سارے کام انجام دیتے ہیں کیوں کہ ہر شخص مقررہ اور مجوزہ راحت و آرام کے خلاف وقت لینا اپنے لئے ننگ و عار کا باعث سمجھتا ہے۔

اُس کے ساتھ ساتھ وطنی حقوق و فرائض بھی ہیں جن کو باشندگان شہر اپنے صنعتی کاروبار کے علاوہ انجام دیتے ہیں مثلاً قلی، کھیت کاٹنا،

سڑکوں کی صفائی و درستگی، عمارت سازی اور شہر کی گندگیوں کو دُور کرنا وغیرہ۔

خارجی تجارت افراد کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ اس جماعت کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس کو شہر کے افراد انتخاب کرتے ہیں۔ اس تجارت سے مقصد دولت و ثروت یا نفع حاصل کرنا نہیں بلکہ تمام ممالک کی اُن مصنوعات و اسباب کو جو مسیحی شہر میں تیار نہیں ہوتے ہیں بطور مبادلہ حاصل کرنا ہے۔

اس نظام کی بنیاد اندریا کے نزدیک مسیحی خاندان ہے۔ ہر چوبیس سالہ جوان اور ہر اٹھارہ سالہ دوشیزہ آپس میں عقد کرتے ہیں اور یہ دونوں اور ان کی اولاد ایک جدید خاندان بناتے ہیں۔ میاں بیوی کے تکلفات کو بڑھانے والی کوئی چیز نہیں، صرف گھر کے لئے نیا ساز و سامان ہوتا ہے جس کو حکومت بلاقیمت دیتی ہے۔ یہ سامان بسیط ہوتا ہے جس کو عورت ادنیٰ توجہ سے پاک وصاف رکھ سکتی ہے۔ اسی لئے "مسیحی شہر" میں گھروں میں خادم نہیں ہوتے ہیں۔ عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور شوہر گھر کے کام کاج میں خیاطی اور نہلانے دھلانے کے سوا، اپنی بیوی کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ایک عمومی باورچی خانہ ہوتا ہے جس میں بیوی ضرورت کے مطابق کھانا تیار کرلیتی ہے۔

بچے اپنی ماں کی حفاظت اور زیر پرورش چھٹے سال تک رہتے ہیں،

اس کے بعد مدرسوں میں داخل ہو کر عالم شباب تک اُنہیں کی نگرانی شہر پرستی میں رہتے ہیں، اِن مدارس میں بہترین اور اعلیٰ قابلیت کے اُستاد مقرر کئے جاتے ہیں۔ بچوں کے باپ اپنے بچوں کو جب چاہتے ہیں دیکھ سکتے ہیں مدرسہ کے خارجی اَوقات میں تمام طلباء دستکاریاں سیکھتے ہیں اور اُن کو علوم و فنون کی عادت اور مشق کرائی جاتی ہے۔ ہر طالب علم اپنی طبیعت کے رجحان و میلان کے مطابق کام اختیار کرتا ہے۔ فرصت کے اَوقات جسمانی ورزش اور ریاضت میں صرف کئے جاتے ہیں "مسیحی شہر" کے مدارس میں دو چیزیں ہمارے اعتبار کے لائق ہیں، ایک یہ کہ مدرسہ کے لئے ایسا دستور ہے جو چھوٹی سی جمہوریت کے مشابہ ہے دوسری یہ کہ معلمین و مدرسین شہر کے بہترین باشندوں میں سے انتخاب کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ حکومت کے اعلیٰ وظائف اُن کے لئے مسدود نہیں ہوتے، وہ اپنے تعلیمی فریضہ کو انجام دینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے کیوں کہ دوسرے فرائض کی ادائیگی اُن کے لئے کفیل بن سکتی ہے۔

"تاریخ طبعی کی تعلیم کے متعلق جو ثانوی مدارس میں دی جاتی ہے اِس طرح کہتا ہے کہ "یہاں تاریخ طبعی تفصیل اور بکمال مہارت کے ساتھ بڑی تعداد میں دیواروں پر لکھی ہوئی نظر آتی ہے "آسمان کی ہیئت" زمین کے مختلف حصّوں کے مناظر، مختلف اِنسانوں کے گروہ، حیوانات کی تصویریں، سانپوں کے

اشکال، مختلف قسم کے پتھر اور جواہر کے نقشے اُن کے ناموں کے ساتھ موجود ہیں جن سے طالب علم ان کی طبیعتوں، خصوصیتوں اور اوصاف سے آشنا ہوتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اِس عالم کی چیزوں کو معلوم کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے جب کہ مثالوں اور تصویروں کے ذریعہ سے اُن کے پہلوؤں کو روشن اور اُجاگر کیا جائے جس کی وجہ سے قوت ذاکرہ وحافظہ کو مدد پہنچتی رہے؟ اس لیئے کہ علم جس قدر براہ گوش وسمع صفحۂ ذہن ودماغ پر نقش کرتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر آنکھوں کے ذریعہ مشاہدہ سے ذہن میں مرتکز ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ مولف جرمنی ہے وہ ان مدارس کے جزئیات اور ادنیٰ و اعلیٰ پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور معمولی چیزوں کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ ریاضی، سائنس، تشریح اور دوا سازی کے کارخانوں کو اس اہتمام اور دقت نظری سے بیان کرتا ہے کہ گویا آئندہ حکومت جو عن قریب تشکیل پذیر ہونے والی ہے اُس کے دلکش خواب کی تعبیر ہوگی، چونکہ اس کو علوم کے ساتھ دلچسپی اور محبت ہے اس لئے فنون کی طرف بھی توجہ کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ " ادویہ سازی کے کارخانہ (معمل صیدنہ) کے سامنے فن تصویر کشی کی ایک وسیع دکان ہے، یہ ایسا فن ہے جس کی طرف توجہ کرنے سے اہل شہر کو ایک لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے کیونکہ شہر باوجود مختلف تصویروں اور نقشوں سے آراستہ ہونے کے مختلف ملکوں کے نقشے کھینچتا ہے

اِس دکان میں جوانوں کو تعلیم دینے اور اس کو عام اور آسان کرنے کے لئے تصویریں اِستعمال کی جاتی ہیں۔

سربرآوردہ اور جلیل القدر ہستیوں کی تصویریں اور مجسمے جابجا نظر آتے ہیں جن میں نوجوانوں کے دِلوں میں ان ہستیوں کے اخلاق وصفات کو اختیار کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا غیر فانی جذبہ پیدا کرنے کے پورے سامان موجود ہیں۔"

شہر کی عبادت گاہ طبعی طور پر تمام عمارتوں سے زیادہ اہمیت و جاذبیت رکھتی ہے' اس میں آرٹ کی وہ تمام خوبیاں اور جوہر جمع ہیں جو دوسروں میں نہیں پائے جاتے لیکن اِندریا جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ایک مذہب پرست اِنسان ہے اس لئے وہ معبد میں عبادت کرنے کو جبری قرار دیتا ہے۔ عام جلسے اِس معبد میں منعقد ہوتے ہیں جو کھیل تماشہ، موسیقی اور رقص و سرود پر مشتمل ہیں

یہاں تک ہم نے صناعت، تعلیم اور خاندان کا تھوڑا بہت تذکرہ کیا ہے اب حکومت کا ایک سرسری نقشہ کھینچتے ہیں ——— شہر میں ایک کمیٹی ہے جو چوبیس ارکان پر مشتمل ہے اِس کمیٹی کا اِقتدار اعلیٰ تین اشخاص کو حاصل ہے وزیر، قاضی اور افسر تعلیم، پہلا بمنزلہ، قوم کا ضمیر، دوسرا عقل، تیسرا حقیقت سمجھا جاتا ہے۔

مجرموں کی سزاء کے متعلق کہتا ہے" اِس شہر کے قضاۃ اِس امر کے

پابند ہیں کہ وہ سخت سزا اُن جرائم میں دیتے ہیں جو حقوق اللہ میں انسانوں سے سرزد ہوتے ہیں اور اُس سے کم درجہ کی سزا اُن جرائم پیشہ کو دیتے ہیں جو حقوق العباد میں کسی قسم کی کمی وبیشی کریں اور ہلکے قسم کی سزا اُن جرموں میں دیجاتی ہے جو املاک سے متعلق ہیں —— شہری لوگ قتل وخوں ریزی سے نفرت رکھتے ہیں اِس لئے وہ اپنے قصاص (انتقام) کو جائز نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ ہر انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ قتل ہوجائے لیکن اِصلاح کا مرحلہ اِس قدر دشوار ہے کہ اس کو سوائے جاں فروش اور اولوالعزم ہستیوں کے اور کوئی طے کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔

خوابِ پریشاں

(لارڈ بیکن ۱۵۶۱ء - ۱۶۲۶ء)

(طامس کمپانیلا ۱۵۶۸ء - ۱۶۳۶ء)

بیکن اور کمپانیلا اپنے خوابوں میں مشہور ہیں ان میں سے پہلا انگلستانی ہے اور دوسرا اطالوی۔ جب ہم اُن کے ان نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو سوسائٹی کے اعلیٰ نظام کے متعلق پیش کئے ہیں تو یہ نظرفریب اور پریشاں خواب اُن رنگین خوابوں اور دلِ فریب تخیلات کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں جن کو ان دونوں سے پیشتر افلاطون اور طامس مُور دیکھ چکے ہیں۔ ہاں اتنی بات ہے کہ ان کے خواب پریشان میں دیدہ زیب اور ظاہر فریب خیالات زیادہ ہیں جو اس زمانہ کی زندگی کے حالات

پر روشنی ڈالتے ہیں، جس میں ان دونوں مصنفوں نے اپنی کتابیں تالیف کی تھیں۔

چنانچہ کمپانیلا مدینۃ الشمس (سورج کا شہر) کا خواب دیکھتا ہے جو خط استوا کے پیچھے واقع ہے۔ یہ شہر املاک اور عورتوں کی اشتراکیت کی حیثیت سے افلاطون کی جمہوریت کے مخالف نہیں۔ کمپانیلا کی بعض عبارات و افکار اس قسم کے ہیں جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے واقعات و حالات کی خبر دیتے ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ مدینۃ الشمس کے باشندوں کے پاس ایسی کشتیاں ہیں جو پانی پر ہوا اور کشتی کھینے کے آلات کے بغیر چلتی ہیں یہ ایک عجیب و غریب ایجاد ہے۔

اس شہر کے باشندوں میں سے ایک شخص اس سے گفتگو کے دوران میں کہتا ہے کہ اگر تم ہمارے نجومی اور ہیئت دانوں کی وہ پیشین گوئیاں سنو گے جو آئندہ زمانے کے بارے میں پیش کرتے ہیں تو ایک صدی میں ان کی اس قدر تاریخ جمع ہو جائے گی جو گذشتہ چار ہزار سال کی تاریخ پر فوقیت لے جائے گی۔ بیشک اس زمانے میں طباعت پریس، جر ثقیل، مقناطیس وغیرہ کی ان عجیب و غریب ایجادات کا ظہور ہوگا جن کا وہم و گمان بھی اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مدینۃ الشمس میں ایجادات کی فراوانی ہے اور روز بروز کامیابی و ترقی کے مدارج

طے کر رہے ہیں۔ اس لیئے باشندگان شہر کو غلاموں کے استعمال کی حاجت نہیں رہتی۔ وہ مالدار بھی ہیں اور غریب بھی۔ مالدار اس حیثیت سے کہ اُن کو کسی چیز کی حاجت نہیں اور غریب اس لحاظ سے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اسی بنا پر وہ مصنوعات اور ظروف کے غلام نہیں بلکہ وہ خود اِن مصنوعات کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

یہ بیان اُس مستقبل پر روشنی ڈالتا ہے جس کو کمبا نیلا نے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ اپنے زمانے میں انسانی ضمیر کو بیدار کرنا اور اس سے اس طرح سوالات کرنا شروع کرتا ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ قدیم خداؤں اور دیوتاؤں نے غلامی کا جو قلادہ انسانوں کے گردنوں میں پہنا رکھا تھا اس کو جدید زمانے کے اِنسان بھی تسلیم کرلیں؟ کیا کسی دن یہ اختراعات وایجادات خود اِنسان کے کام اس طرح انجام نہیں دیں گے کہ اِنسان کے سر سے لعنتِ آدم دور ہو جائے۔ یا رفتہ رفتہ غلامی کا قلع قمع کر دیا جائے؟

کمبا نیلا خود ان سوالات کا جواب دیتا ہے اور غلامی کی بنیادوں کو ایک دم مسمار کر دیتا ہے۔ تمام کاروبار کو جن کے لوگ محتاج ہوتے ہیں صرف چار گھنٹوں میں محدود کرتا ہے کیوں کہ تمام کے تمام کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اختراعات وایجادات کی وجہ سے بھی وقت کافی بچ رہتا ہے۔

عام طور سے ہمارے خواب ہمارے مزاجوں کے موافق اور احساسات کے تابع ہوتے ہیں، اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ طامس مور اور انڈریا دونوں رشتۂ نکاح میں منسلک ہو چکے تھے اس لئے اُن کے خاندان تھے، خاندان ہی کی بنیاد پر سوسائٹی کی تعمیر ہوئی تھی جس کا بنیادی تصور ان دونوں نے قایم کیا تھا، چونکہ افلاطون اور کمپانیلا کی کوئی اولاد نہیں تھی اور یہ دونوں تنہا تھے، اس لئے اُنھوں نے عورتوں کی اشتراکیت کو سوسائٹی کا ایک جزو قرار دیا، جس کو ان دونوں نے اپنے خوابوں میں دیکھا تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان اپنی طبیعت اور خواہش کے مطابق خیال کرتا ہے، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ افلاطون باوجود صاحب اہل وعیال نہ ہونے کے پورے طور پر عورتوں کی اشتراکیت پر یقین و اعتقاد نہیں رکھتا تھا، اُس نے اشتراکیت کو محض دو اونچے طبقوں میں محدود کر دیا تھا، باقی کاشتکاروں اور پیشہ وروں کے طبقے طبعی طور پر شہر اور قوم میں جمہوری حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے افلاطون ان میں اشتراکیت کے نفاذ کا قائل نہیں تھا، اس کے علاوہ اس کے اِس نظریہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو پہچانتا اور مانتا تھا کہ شادی جو خاندان کے لئے اصل و بنیاد ہے قوم اور نسل کی پیدائش و افزائش کے لئے نہایت ضروری ہے، اُس نے اوصیاء اور جنگجو طبقہ کو شادی اور تاسیس خاندان سے جو محروم رکھا اس میں یہی فکر

اور تخیل کارفرما تھا کہ ان دونوں مقاصد کی خدمت کے لئے اپنے وجود کو فنا کر دینا چاہیئے، یہ نظریہ وہی ہے جس کو راہبوں نے ایجاد کیا کہ بسا اوقات ایک فنی شخص کو اپنے فن کی مصلحت کے لئے شادی سے روک دیا جاتا ہے جس طرح سے ایک مسیحی راہب اس لئے شادی اور عقد نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنے وجود کو دین کی خدمت کرنے اور اپنے نفس کو زہد و عبادت میں گذارنے کے لئے وقف کر چکا ہے، اسی طرح افلاطون یہ چاہتا ہے کہ وصی ہرگز شادی نہ کرے بلکہ ساری عمر اور تمام جد وجہد بیوی بچوں سے علیحدہ ہو کر قوم کی مصلحت و خدمت پر صرف کر دے، اس لئے کہ اگر وہ شادی کرے تو اپنی بیوی بچوں میں الجھ جائے گا اور بنی نوع انسان کی خدمت و اصلاح کا فرض اس سے ادا نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ افلاطون کے پاس ایسے کاموں سے روکنے والی اور پست ہمت بنانے والی چیز شادی ہے لیکن اس میں استثنار کی بھی گنجائش ہے قیود کے ساتھ جائز ہے۔

اب ہم بیکن اور اس کے پریشان خوابوں پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں جس طرح ہم نے دیکھ لیا کہ کمپانیلا نے کوئی اعلیٰ تخیل پیش نہیں کیا اسی طرح بیکن کا بھی حال ہے بلکہ کمپانیلا کے افکار پر قیاس کرتے ہوئے بیکن کے طائر فکر کا ایک بازو زخمی ہے اس کے علاوہ کمپانیلا کے بازو کی بہ نسبت بیکن کے بازو

ہیں بکثرت مستعار پر لگے ہوئے ہیں۔ اِن مستعار پروں کے ذریعہ سے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اُس نے اندریا کے اصل تخیل اور افلاطون کے مقام خواب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، اِس لئے دوبارہ اُس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

جو چیز بیکن کے خواب میں اہمیت رکھتی ہے وہ بیت سلیمان (سلیمان کا گھر) ہے یہ عمارت کالجوں سے کچھ مشابہت رکھتی ہے، اِس کا مقصد یہ ہے کہ اشیاء میں جو حرکت و زندگی پائی جاتی ہے اُس کی علت و سبب اور اُن اشیائ کے اسرار و رموز معلوم کئے جائیں۔ اِنسان کے اقتدار و قوت کو اس حد تک وسیع کیا جائے کہ ہر ممکن چیز کو اپنے قبضہ میں لانے اور اُس پر عمل درآمد کرنے سے کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ ہو۔ اِس عمارت میں ٹیلوں کے اِردگرد کارخانے اور مختلف "تجربہ گھر" بنائے گئے ہیں۔ ایسی رصدگاہ ہیں جن کے بُرجوں کی بلندی نصف میل تک پہنچتی ہے۔ یہاں کھارے اور میٹھے پانی کے چشمے ہیں۔ بیکن کے ان تمام بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا اِرادہ یہ ہے کہ مچھلیوں اور تمام آبی زندہ جانوروں کی پرورش اور نشو ونما کے لئے ایک تجربہ خانہ چاہیئے یہاں اشیاء کو منتقل کرنے اور گھمانے والے آلات، اَدویہ کے تجربہ کے لئے شفاخانے، طبعی و کیمیاوی تجربات و مشاہدات کے لئے بڑے بڑے میدان، وسیع ہال اور غذا و خوراک میں عملی تجربات کے لئے وسیع پیمانہ پر زراعتی مراکز ہیں۔ پھر اَدویہ سازی (صیدلی) اور

صنعت وحرفت کے کارخانے، اور آواز، روشنی، خوشبو، مزہ وغیرہ کے امتحانات کے لئے دیگر تجربہ خانے بھی پائے جاتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں "بیت سلیمان" میں پائی جاتی ہیں، جن کو یہ بے ضابطہ وغیر منظم طومار کی صورت میں جمع کرتا ہے، اُس کا یہ "پریشان خرمن" بہ نسبت ترتیب دار خواب کے مبہم ومشتبہ ہے"۔

اِس کالج یا "بیت سُلیمان" سے بارہ منتخب افراد، سیر وسیاحت کرنے نادر کتابوں کو حاصل کرنے اور ان عجیب وغریب اختراعات کے متعلق معلومات قلمبند کرنے کی غرض سے جو دوران سیاحت میں پیش آتی ہیں غیر ممالک کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ یہ کالج بیکن کے شہر میں جس کو وہ "جدید اٹلنس" سے موسوم کرتا ہے نہایت اہمیت رکھتا ہے اور اس شہر میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں تقریباً وہ تمام وہی ہیں جن کو ہم افلاطون اور اندریا کے خواب میں دیکھ چکے ہیں۔

یہ کالج جس کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں بیکن کا وہ منظر خواب ہے، جس کو اب تک "علماء کلیات" دیکھتے رہے ہیں۔ اس کے بعض پہلوؤں کے ولایاتِ متحدہ میں "موسس لاکفیلر" میں ظاہر ہونے کی اُمید کی جاتی ہے، یہ تمام بیکن کے تخیلات کا ثبوت ہیں اور ایسی ہستی کے افکار و نظریات ہیں جو ارتقاء یورپ کا ایک رکن ہونے کے لایق ہے۔ بیکن بجائے نقل کے

عقل کا قایل ہے، وہ تقلید کی ساری آہنی بندشوں کو توڑ کر عقل و شعور کی سرحد میں قدم دھرنا چاہتا ہے، اُس کا مقصد یہ ہے کہ حقایق کی بنیاد تجربہ و امتحان پر رکھی جائے۔ اِنسانی قوتوں کو علوم و معارف میں ترقی کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اور قوم اِس ترقی کے لیے ہر قسم کے اَسباب و وسائل فراہم کرے۔ بیکن کا نظریہ یہ ہے کہ صنعت، زراعت، طب یا اس کے علاوہ جتنی اِنسانی معارف و فنون کی شاخیں ہیں تمام کے لئے تجربہ و اِمتحان کے وسائل و ذرائع مہیا کئے جائیں۔ کیونکہ تجربات و مشاہدات ہی پر علوم و فنون کے اُصول و قوانین کی بنیادیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ باوجودے کہ اس کا خواب تشویش و پریشانی کے عنصر سے خالی نہیں پھر بھی اُس نے ہمارے سامنے ایسا خاکہ اور لائحہ عمل تیار کر دیا ہے جس سے ایسی مکمل یونیورسٹی کے وجود میں آنے کی توقع کی جا سکتی ہے، جس کا مقصد یہ ہو کہ علوم و معارف کے میدان میں ہم ہمیشہ اور روز افزوں ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرتے رہیں! ——

دورِ ایجادات اور اُس کے خواب

---

(۱) شارل فوریہ (۱۷۷۲ء - ۱۸۳۷ء)

(۲) رابرٹ اوین (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء)

(۳) جیمس بکنگھم (۱۸۵۵ء)

اُٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی صنعتی اختراعات و ایجادات کے ظہور اور اُن کی فراوانی پر جس قدر فخر و ناز کرے کم ہے۔ اگر اس مختصر سی مدت کے ایجادات کو آج سے پچاس ہزار سال پیشتر تک کی انسانی صنعتی اختراعات کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھا جائے تو اپنی گوناگوں صنعتوں اور متعدد نوعیتوں کے لحاظ سے خواہ وہ زیادہ مفید ہی کیوں نہ ہوں فوقیت لے جاتی ہیں۔ محض یہی کثرت و فراوانی اس امر کی طرف

زبردست دعوت تھی کہ انسان آلات کے مستقبل میں غور و فکر کرے اور اُن سے یہ اُمید رکھے کہ یہ آلات خود اُس کے کاروبار انجام دیں اور اُس کی راحت و آسائش میں فراوانی پیدا کریں ——— پھر جب آلات کا ظہور ہوا اور لوگ صنعتوں کی طرف پیش قدمی کرنے لگے تو عظیم الشان ثروت و سرمایہ داری قدیم گھرانوں سے جدید افراد کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی، اِس نقل و حرکت اور تبدیلی سے قدیم و جدید افراد میں یکجہتی ناپید ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کے اندر ایک ہیجان و اضطراب کا عالم پیدا ہوگیا جس کے اِنتہائی نتیجہ میں اِنقلاب فرانس واقع ہوا۔

آج تک جتنے اِنقلابات رُونما ہوئے ہیں درحقیقت اُن کا سبب یہی تھا کہ اِس قدیم نظام کی اِصلاح کا قصد کیا گیا جو جدید سوسائٹی کے سراسر مخالف تھا اور اُس کی اِصلاح کو ناممکن تصور کرتے ہوئے اِنقلابی طوفان کے ذریعہ سے قدیم نظام کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کی گئی۔ اِن تمام ہیجان انگیز حالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ماحول کے اندر اِس قسم کی صلاحیت موجود تھی کہ ایک مصلح اور دُوربین شخص سوسائٹی کے متعلق اپنے اِصلاحی و تشکیلی خواب و خیال کو پیش کرسکے۔

پہلے ہم بیان کرچکے ہیں کہ ایک اِنسان اپنی سوسائٹی کے درمیان جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا، ماحول کی خرابیوں اور سوسائٹی کی بدنظمیوں

سے واقف رہتا ہے اِن تین حالتوں میں سے کسی ایک کو اِختیار کر لیتا ہے۔

(۱) اپنی سوسائٹی سے بھاگ کر کسی ایسے ماحول میں داخل ہو جائیگا جو اُس کے موافق ہو۔

(۲) اُس کی مدافعت کرے گا اور اُس سے بچنے کی کوشش کرتا رہے گا۔

(۳) رات دن سوسائٹی سے دست وگریبان رہے گا اور اُس سے بحث ومناقشہ کرے گا۔

جب ہم اٹھارہویں صدی کی ہستیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو ہم پہلے گروہ میں پاتے ہیں جو اپنی سوسائٹی اور ماحول کو چھوڑ کر بھاگنا چاہتے ہیں، اِس لئے کہ ان کو اس میں اِس قدر خرابیاں اور بدنظمیاں نظر آئیں جن کی تاب نہ لاکر اُنھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی دور دراز خاموش فضا میں جا کر سکون وطمانیت کی سانس لیں اور کشاکش حیات سے نجات پائیں، اِن سب میں پیش پیش رابن سن کروزو ہے جو دور ایک جزیرہ میں سادہ دیہاتی زندگی بسر کرنا اپنا شعار قرار دیتا ہے اور تنہا کفایت کے ساتھ بود وباش اِختیار کرتا ہے اور اپنی اِس سادہ زندگی کو، شہری زندگی، تمدن کے بے جا تکلفات اور عیش پرستیوں پر ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ

جان جاک روسو تہذیب و تمدن کے فسادات و نقصانات میں کتابیں لکھتا ہے اور بتلاتا ہے کہ کس طرح علوم و فنون کے عام ہونے سے لوگ اپنی فطری سادگی و صلاحیت کھو بیٹھے اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہو گئے، ایسے لوگوں کو پھر اپنی فطرت و طبیعت کی طرف لوٹ آنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔

شاتوبریان اس "شریف وحشی" انسان کو جمال و جلال کی لطافتوں کا مرکز ٹھہراتا ہے جو امریکہ کے دیہاتوں میں فطری زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر جب اپنی صورت حال پر نظر ڈالتا ہے تو خود کو بھی اس "شریف وحشی" انسان کی فطری دنیا میں لے جانے کا تصور کرتا ہے جو تہذیب و تمدن کی مسموم فضا سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔

برنارڈین سان بیئیر کا مدنیت و حضارت کی تکلیفوں سے دم گھٹنے لگتا ہے، چنانچہ وہ اپنے خیال میں سعادت و خوش حالی کا مقام محض جنوبی افریقہ کی گھاٹیوں میں تلاش کرتا ہے، جہاں طبیعت پر ہمیشہ دوشیزگی چھائی رہتی ہے، عشق و محبت کے شریفانہ جذبات اور فطری احساسات اندرونی و ناگہانی طور پر جسم کے رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں، جن کا شعور نہ تو نوجوان کو ہوتا ہے اور نہ ہی دوشیزہ کو، کیوں کہ یہ دونوں اس طرح دیہی زندگی گذارتے ہیں کہ ان کے سر سے پاؤں تک نادانی، سادگی

اور معصومیت چھائی رہتی ہے حضارت وتمدن کے اس مخالف کی رائے میں سادگی وجہالت ہی شرافت وسعادت کا اساس ہے۔

طبیعت اور اس کی سادگی کو اختیار کرنا اور دیہی زندگی اور فطری آزادی کی طرف کھنچ کر چلے آنا ہر انسان کا طبعی خاصہ ہے۔ جب ہم پر تمدن وحضارت کا بوجھ گرانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہماری نظروں میں ہجوم آلام ومصائب کی وجہ سے عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے تو ہم اپنے "فطری مرکز" کی طرف لوٹ آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اسی "قوتِ ارتداد" کے ذریعہ سے ہم میں زندگی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جتنی بڑی بڑی ہستیاں گذری ہیں اگر وہ تمام ان راہبوں اور عزلت نشین مذہب پرستوں کی روش اختیار کر لیتے جو حقایق ومشاہدات کی شاہراہ سے ہٹ کر جنت الفردوس کے وہم وخیال میں سرگرداں نظر آتے ہیں تو اس مقصد ومدعا کا پورا ہونا غیر ممکن ہو جاتا جو ہم ان کے خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں ہماری غرض وغایت ان مصلحین اور ارباب بحث ونظر سے ہے جو اپنے ماحول اور سوسائٹی سے علیحدہ ایک مکمل یا اس کے مماثل جدید تمدن وحضارت کی بنیادوں کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔

اگر فلاسفہ کی ان خوش حالیوں اور خوابوں کا شمار کیا جائے جن میں

اُنھوں نے اپنے موجودہ نظام سے بلند و اعلیٰ تخیل پیش کیا ہے تو ان خوش حالیوں کے دو ثلث حصے اُنیسویں صدی عیسوی اور باقی تمام صدیوں کی طرف منسوب کئے جائیں گے، اِس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس صدی کے اختراعات و ایجادات بیشتر ہیں اور اس میں بکثرت صنعت پھیلی ہوئی ہے۔ سوسائٹی کے موجودہ توازن اور نظام میں واضح ترین فساد و خلل واقع ہو گیا ہے اور لوگوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو مزدوروں پر ظلم و جور ڈھا کر کثیر منافع حاصل کر رہا ہے، اُن کے لئے محض اِس قدر منافع دیئے جاتے ہیں جو ان کی ضروریات کو بھی کافی نہیں ہو سکتے۔

صنعتی کاروبار ظہور آلات سے پہلے ان پیشہ وروں اور کاریگروں کے ہاتھ میں تھے جو خود مستقل طور پر اپنے ہاتھوں سے چلاتے تھے، چنانچہ ایک موچی اپنے آلات و اوزار کم دام پر خریدتا تھا اور شہر کے ایک جانب دوکان کھول کر جوتے بناتا اور بذاتِ خود اُنھیں بیچا کرتا تھا، یہ تمام کام خود اپنی رضامندی سے انجام دیتا تھا، نہ اُسے اپنی حکومت سے بیر تھا۔ اور نہ اس تمدن سے دشمنی جس نے یہ موجودہ نظام قائم رکھا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد آلات و اوزار کا دور شروع ہوا تو قلیل وقت میں ہزاروں سے جوتے بنائے جانے لگے، جن سے بازار معمور نظر آنے لگے، اب اکیلے

موچیوں کی مصنوعات کا بازار سرد پڑ گیا چنانچہ ایک موچی کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ کسی بڑے کارخانے میں جہاں ہزاروں سے چیزیں بنائی جاتی ہوں نوکر ہو جائے۔ یہی حال تمام مصنوعات کا بھی تھا کہ اُن کی مقدار میں کمی واقع ہونے لگی کیوں کہ وہ کاریگر جو اپنی مصنوعات کو اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اپنا مال ان مزدوروں کے حوالہ کر دیتے تھے جن کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہوتا کارخانہ میں اگر مال کی فراوانی ہے تو اُن کا مال واپس کر دیا جاتا اور بہت ہی کم قیمت اُن کی مزدوری کی ادا کی جاتی تھی اِن مشکلات سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مزدور طبقہ نہایت افلاس و غربت اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائے اور کارخانہ چلانے والے دولت و ثروت کے مالک بن بیٹھیں۔ چنانچہ اِس تفاوت و فرق کا یہ نتیجہ ہوا کہ مزدور طبقہ کے جذبات بھڑک اٹھے اور اشتراکی طوفان خیز تحریکات کا ظہور ہونے لگا۔ کیا عجب ہے کہ اشتراکیت

(- - - - - - - - -) کا لفظ تقریباً ۱۸۲۵ء میں ظاہر ہوا ہو نظام اشتراکیت کا مقصد صرف وہ خوش حالی و ترقی ہے جس کو مزدور طبقہ مستقبل قریب میں دیکھنے کا آرزومند ہے اور اب تک وہ یہی دل فریب خواب اور آرزوؤں کے سبز باغ دیکھ رہے ہیں لیکن اجنبی قوموں کے سیاسی حالات و واقعات میں تلاش و جستجو کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اِس خوش حالی یا اُس کے مماثل ظاہر ہونے کے خواہش مند تھے یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں بڑی بڑی ہستیاں

یا اُن میں سے اکثر و بیشتر سربرآوردہ لوگ اشتراکی تھے۔ اشتراکیوں کا یہ طبقہ آلات میں اور ان کے نتیجہ میں جو مصنوعات کثیر مقدار میں بنتی ہیں غور و فکر کرنے کے بعد یہ سوالات کرتا ہے کہ کیوں نہیں قوم ان آلات کی مالک ہو جائے اور ان سے اتنا لباس تیار کرے جو لوگوں کو کافی ہو سکے؟ کیا وجہ ہے کہ یہ آلات زراعت میں استعمال نہیں کئے جاتے تاکہ کسان کا وقت بچ جائے اور اُس کو اپنی مرضی کے مطابق اولاد کی پرورش اور خوش حالی میں صرف کرے؟ یہ کس طرح روا ہے کہ مال دار طبقہ ہی اُن تمام منافع کا جو ان مصنوعات سے حاصل ہوتے ہیں مالک بن جائے؟ کیا یہ انصاف نہیں ہے کہ اختراعات بکثرت عام ہوں اور ان سے قوم کا ہر فرد فائدہ اُٹھائے؟

وہ پہلا خواب جس کا نصف حصہ اُنیسویں صدی کے خوابوں میں سے ہے۔ شارل فوریہ (ولادت ۱۷۷۲ء وفات ۱۸۳۷ء) نے دیکھا جو فرانس کا اشتراکی لیڈر تھا۔ فوریہ نے بیداری نما خواب یہ دیکھا کہ ایک جماعت جس کی تعداد ۱۶۰۰ کے قریب ہے ایک ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے تمام افراد دارکان خود اپنی حاجتوں کو پورا کر لیتے ہیں۔ وہ قوم جس کی اس طرح تشکیل و تنظیم ہے اُسی نہج پر دیگر جماعتوں کو بھی تقسیم کرتی ہے۔ ان میں سے ہر جماعت دوسروں سے التجاء کئے بغیر اپنی ضرورتوں کی خود بخود تکمیل کرتی ہے۔

غوریہ کی رائے میں انسان سہ گانہ شخصیت ہے۔

(۱) وہ صنعتی ہے اپنے اور سرسائٹی کے درمیان جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے صنعت کے ذریعہ سے ربط و اتحاد قائم کرنا چاہتا ہے۔

(۲) اجتماعی شخصیت ہونے کی حیثیت سے وہ جس جماعت کی طرف منسوب ہے اس کے اور اپنے درمیان یکجہتی و یگانگت پیدا کرنے کا متمنی ہے اور

(۳) ذہنی شخصیت ہونے کی وجہ سے اُن نوامیس و قوانین کے معلوم کرنے کا محتاج رہتا ہے جو کائنات عالم کے نظام میں جاری و ساری ہیں۔ فوریہ اس سہ گانہ شخصیت کے لئے ایک جماعت بناتا ہے جو ۱۶۰۰ ہزار افراد پر مشتمل ہوتی ہے وہ ایسی مختلف المناظر اور گرد و پیش والی سرزمین میں ٹھراتا ہے، جہاں پہاڑ، نہریں، جنگل اور شہر پائے جاتے ہوں۔ باشندوں کا اصل پیشہ زراعت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندے دیگر فنون و صناعات کی مشق کرتے ہیں کیوں کہ ہر جماعت ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔

اس سرزمین کے وسط میں جہاں یہ جماعت سکونت پذیر ہے ایک شاندار عمارت ہے جو تمام جماعتوں کی حاجتوں کو پورا کرتی ہے اس کے تین حصے ہیں:- (۱) صنعتی۔

(۲) اجتماعی۔

(۳) ذہنی۔

پہلے حصہ میں بے شمار کارخانے اور بڑے بڑے ہال ہیں۔ تیسرے حصہ میں کتب خانے، علمی ذخیرے، عجائبات اور رجال فن (۔۔۔۔۔۔) کے لئے وسیع ہال ہیں۔ اجتماعی حصہ وسط میں ہے جس میں کھانا کھانے، ملاقات اور داستان گوئی کے لئے کمرے پائے جاتے ہیں۔ عمارت کے انتہائی جانب ظاہری یگانگت و اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک "اجتماع گاہ" ہے جو رقص و سرود، موسیقی، شعر اور تصویر کشی کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری جانب کے انتہائی حصہ میں ایک معبد اتحاد ہے جہاں خاص طریقوں سے انسانکو کائنات کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کے لئے محفل منعقد کی جاتی ہے۔ یہاں ایک برج اور رصدگاہ ہے جس میں ایک ٹیلیفون تمام جماعتوں سے اتصال قائم کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔

یہ عمارت جو طبعی طور پر ایک کامل شہر کی صورت رکھتی ہے اس کے باشندے ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کے لئے ایک ہی باورچی خانہ ہے، بچپن ہی سے بچوں کو کھانا پکانا سکھایا جاتا ہے، یہ بھی تمام کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں، اگرچہ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ ہر انسان اپنا کھانا تنہا علیحدہ کھا سکتا ہے۔ ہر جماعت کے لئے غذا، مسکن اور لہو و لعب کی ایک خاص معین مقدار ہے جس میں تمام افراد جماعت مساوی درجہ رکھتے ہیں

اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ کون کتنا کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر فرد کو دیگر امتیازات حاصل کرنے کا حق ہے اور یہ جماعت میں اُس کے حصّوں کا اعتبار کرتے ہوئے دیئے جاتے ہیں؛ چنانچہ یہاں ایک محنتی جفاکش اور ایک سُست کاہل مزدور کے درمیان امتیاز کی حدِ فاصل قائم کی جاتی ہے؛ پھر یہاں ایک حد تک انفرادی ملکیت کی بھی اجازت ہے۔ چنانچہ جماعت باہم شریک کار کی حیثیت سے اشتراکی زندگی بسر کرتی ہے؛ اُن کے تمام افراد باہم مساوی ہوتے ہیں؛ پھر جس کے حصے دوسروں سے زیادہ ہوں وہ ممتاز قرار دیئے جاتے ہیں؛ لیکن یہ امتیاز ایک محدود اثر رکھتا ہے کیونکہ منافعہ تمام پر صرف ہونے کے بعد آخر میں بہت تھوڑا رہ جاتا ہے جو ناقابلِ اعتنا ہے۔ اس نظریہ میں جیسا کہ قارئین پر واضح ہے اشتراکیت و انفرادیت میں موافقت پیدا کرنے کی کچھ جھلک موجود ہے۔

مصنوعات اقتصادی پہلو کو پیش نظر رکھ کر ایک وسیع نظام پر تیار کی جاتی ہیں؛ ہر مزدور کے لیے عمل کا ایک حصہ خاص کر دیا جاتا ہے تاکہ اس میں سے معتد بہ کام قلیل مدت میں پورا کر سکے۔ جماعت مل جل کر ایک ہی جگہ تجارت کرتی ہے اور اپنا مال و اسباب دوسری جماعتوں کو فروخت کرتی ہے؛ اور منافع افراد پر اُن کے حصوں کی نسبت تقسیم کر دیئے جاتے ہیں جیسا کہ آج کل انجمن ہائے امداد باہمی (- - - - - - - - - - -) کیا کرتی ہیں۔

عورت اس نظام میں آزاد ہے اور مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہے، فوریہ کی رائے میں شادی اس آزادی کے لئے راس نہیں آتی۔ اس عمارت میں شیرخوار بچوں کی تربیت کے لئے ایک مستقل مکان ہے۔ جماعت کیلئے ایک لشکر بھی ہے، یہ جنگی مقاصد سے تیار نہیں کیا گیا بلکہ اس کا کام نہریں کھودنا، جنگلوں میں زراعت کرنا، پل تعمیر کرنا، تر زمین کو خشک کرنا اور اس کے علاوہ اسی قسم کے دوسرے کام انجام دینا ہے۔ اس میں فوریہ کا یہ نظریہ ہے کہ یہ جوانوں کے نشاط وصحت کو بحال رکھنے کے لئے اچھا مصرف ہے جہاں بمنزلہ جنگ کام انجام دیئے جاتے ہیں۔

رابرٹ اوین (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء) کے خیالات مذکورۂ بالا بعض نظریات کے مخالف ہیں، اس حیثیت سے کہ اس نے فرضی وخیالی تصورات پیش نہیں کئے بلکہ اس نے ایک ایسی سوسائٹی کو ایجاد کرنے کا قصد کیا جس کا قائم کرنا آسان ہے۔ خود وہ مزدوروں میں زندگی گذار چکا ہے اور بہت سے کارخانوں کو چلا چکا ہے۔ اس اثنا میں انسان اور آلات کے تعلق اور آلات کو اصلاح یا فساد کا وسیلہ بنانے کے امکان پر کافی غور وخوص کر چکا ہے۔ اس نے محض تصنیف وشرح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سوسائٹی کی بنیاد وتنظیم میں عملی طور پر حصہ لیا۔ بہت سارے کارخانوں کی بنیاد ڈالی

اور اُن کو مشہور قانون ساز بنتھم کے ساتھ مِل کر اپنے اِشتراکی خیالات و آرا کے موافق چلایا آخر کار اُس کے یہ عملی تجربات رُوپوش ہو گئے۔

چوں کہ ہماری اِس کتاب کا موضوع فلسفیوں کے خوابوں کو بیان کرنا ہے اِس لئے ہم اوین کے تجربات میں جانا مناسب نہیں سمجھتے، ذیلی طور پر ہم نے اس کو اِس وجہ سے ذکر کر دیا کہ اُس کے خیالات و تجربات میں اِشتراکیت کا پہلو پایا جاتا ہے اُس نے مزدوروں کی تمام تحریکات میں اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی روشن مثالیں اور بعد میں آنے والوں کے خوابوں کے لئے ایک عظیم الشان یادگار چھوڑی ہے۔

اَب ہم مشہور و معروف خیالی شخص جیمس بکنگھم (۱۸۵۵ء) کی طرف رجوع کرتے ہیں اُس نے اپنی زندگی کے اکثر ایام مشرق میں گذارے ہندوستان میں متعدد انگریزی رسائل کا ایڈیٹر رہا۔ اِس کے علاوہ اُس نے دنیا بھر کی سیر و سیاحت کی کہیں مستقل ایک جگہ نہ ٹھہرا مختلف مُلکوں میں گیا وہاں کی ہر چیز پر غائر نظر ڈالی آخر کار اُس نے ایک کتاب "قابل اِصلاح بُرائیاں عملی تدابیر اور ایک مثالی شہر کا خاکہ" لکھی، یہ کتاب تقریباً ۱۸۴۸ء کے اُن اِنقلابات میں منظر عام پر آئی جو پُورے یُورپ کی فضاؤں پر چھا گئے تھے۔ یہ کتاب اُن اسباب و دواعی پر دلیل ہے

جو انقلاب انگیز خیالات کو مفکرین کے دماغوں میں پیدا کرنے کا باعث تھے۔

آخر وہ مثالی شہر کیا ہے؟ یہ وہی شہر ہے جو وکٹوریا کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کو مشترک افراد نے محدود ذمہ دار شرکت کے طریقہ پر تعمیر کیا ہے۔ اس شہر میں جدید تمدن کی تمام لطافتیں اور خوبیاں موجود ہیں۔ مثلاً تعمیر مکانات، نقشہ کشی، کنواں کھودنا، عمارت سازی، پانی، روشنی، اور اسی قسم کی دیگر تمام چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی مساحت ایک میل مربع ہے۔ باشندوں کی تعداد ۱۰۰۰۰ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ شہر کے کنارے کارخانے بنائے جاتے ہیں، ان میں جو مصنوعات تیار ہوتی ہیں وہ مشترک طور پر جماعت کی ملک ہوتی ہیں۔ نہ کہ ان افراد کی جو انھیں تیار کرتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تقریباً ۱۰۰۰۰ ہزار ایکڑ زمین ہے۔ یہ بھی جماعت کی ملک ہے۔ مکانات اور زمینوں کے مالک افراد نہیں بلکہ جماعت ہی مشترک طور پر انکی مالک ہوتی ہے اور یہ باہم مل کر تمام چیزوں کو بکثرت پیدا کرتی ہے، ان سے جو منافع حاصل ہوتے ہیں تمام افراد پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی کو اشتراک کی اس وقت تک اجازت نہیں دی جاتی جب تک وہ کم از کم بیس حصوں کو حاصل نہ کر لے اور اپنی نیک نیتی کا شہر کے ساتھ ثبوت بہم پہنچائے۔ اس کے ساتھ اس سے ایک عہد و پیمان

بھی لیا جاتا ہے جس میں اُس پر شراب نوشی، نشہ آور اشیاء، جڑی بوٹیوں اور دُخان کے اِستعمال، کی ممانعت رہتی ہے۔

شہر میں حمام باورچی خانے اور عام ہوٹل ہیں۔ ایک عمومی مکان بھی ہے جہاں شیر خوار بچوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ علاج مفت ہوتا ہے جیسا کہ لشکر میں معمول ہے۔ شہر میں قضاۃ اور عدالتوں کا کہیں وجود نہیں۔ یہاں محض وہ قوانین نافذ کیے گئے ہیں جن پر عمل درآمد کرنے کے لئے باشندوں سے عہد وپیمان لیا جاتا ہے۔ جب دو اشخاص کے درمیان اِختلاف واقع ہوتا ہے تو یہ دونوں فریق ایک حکم کا اِنتخاب کرتے ہیں جو اُن کا فیصلہ کرتا ہے۔ باشندوں سے یہ عہد بھی لیا جاتا ہے کہ وہ اِس منتخب حکم کے فیصلہ کو تسلیم کریں۔ یہ معاہدات ضروری ہیں کیوں کہ وکٹوریہ شہر کو جس حکومت میں بھی قائم کرنیکا اِرادہ کیا جائے وہاں اِن معاہدات کا ہونا لازمی ہے تاکہ اُس کے اطراف واکناف کے شہر اور آبادیاں بھی مستقل طور پر اُسی کے زیر ادارت زندگی بسر کریں۔

جس طرف نظر اٹھا کر دیکھیے انگریزی حکومت اور اُس کے قوانین کا دور دورہ ہے۔ یہ وہ لائحہ عمل ہے جس کو ہر ایک جگہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ نہ لوگوں کو اِس پر زبردستی کی جاتی ہے اور نہ وہ خود اِس امر کا محتاج ہے کہ ساری قوم کو اپنے ساتھ شامل کرلے کیوں کہ کسی قانون یا حکومت کے کامیاب ہونے کے لئے اِتنا ہی کافی ہے کہ اس پر ... ۱ ہزار افراد کاربند رہیں۔ بکنگھم

اِس بات کا قائل ہے کہ جب اِس قسم کی جماعت تشکیل پذیر ہو جائے اور اُس میں وہ ایک حد تک کامیاب ثابت ہو تو تمام ممالک اس کے نقش قدم پر چلنے لگیں گے اُس کا نظریہ جیسا کہ قارئین پر ظاہر ہے یہ ہے کہ ایک بہت بڑی جماعت باہمی تعاون کے ساتھ غلہ اور مال و اسباب کو بذات خود فروخت کرے پھر اُن کے منافع افراد پر اُن کے حصّوں کے مطابق تقسیم کر دے!! ——

اُنیسویں صدی کے خواب

اتین کابیہ (ولادت ۱۷۸۸ء وفات ۱۸۵۶ء)

اُنیسویں صدی اور اس کے قریب تر بیسویں ربع صدی کے خواب تمام تر آلات اور مزدوروں کے خواب تھے، یہ سب کے سب گذشتہ تمام خوابوں کی بہ نسبت اشتراکیت کے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں، لیکن یہ زیادہ تر مزدور طبقہ اور آلات کو سوسائٹی کے لئے اساس قرار دینے پر اپنی پوری توجہ صرف کرنے میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں، افلاطون ان دونوں خصوصیات سے نا آشنا تھا، اُس نے اپنے ذہن سے پیشہ ور اور مزدور طبقہ کے مسئلہ کو فراموش کر دیا، اُن کی طرف بہت کم توجہ کی، آلات کے لئے سوسائٹی میں وہ اثر و اہمیت نہیں تھی، جو اُن میں غور و فکر

کرنے کی طرف دعوت دے سکے، لیکن اُنیسویں صدی میں ان تمام حالات میں ایک زبردست اِنقلاب رُونما ہوا، چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی اِختراعات و آلات اور مزدوروں کا نیا دَور کہلائے جانے میں باہم شریک رہے۔

اُنیسویں صدی کے مشہور خواب دیکھنے والوں میں اتین کابیہ ہے، جو ۱۷۸۸ء میں اِنقلاب فرانس کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں نپولین سوئم کی شہنشاہیت کے شروع میں وفات پائی، اس کو اپنے بچپن میں تاریخ عالم کی ایک مافوق شخصیت نپولین اعظم کو دیکھنے کا موقعہ مِلا، جس کے عظیم الشان اِنقلابات سے ۱۸۴۸ء میں اُنیسویں صدی کو گذرنا پڑا، اِس صدی میں بے شمار اِختراعات کا ظہور رہا، جو درحقیقت نظام جماعت میں اِنقلابات کا ایک نمایاں اور گہرا اثر ہیں۔

اتین کابیہ کا میدانِ خواب "ایکاریہ" ہے، یہ وہ اِقلیم ہے، جو اِنقلاب فرانس کے طریقہ پر اقسام اعشاریہ پر منقسم ہے، اِس میں سو شہر ہیں، جن کی مساحت اور باشندوں کی تعداد مساوی ہے، اُن میں سے ہر رتبہ مساوی مرکز پر منقسم ہے۔ کابیہ کے پاس یہاں کی نرم و سخت زمین یا سرسبز و شاداب اور خشک وادی کے درمیان کوئی خصوصیت نہیں ہے، وہ صرف اپنی سلطنت کو تقسیم کرتا ہے، یہ تقسیم اِنقلاب فرانس کی اس قوت سے ماخوذ ہے، جس نے میٹری نظام کی تاسیس کی، اِیکاریہ

کے وسط میں ایک شہر ایکار ہے، جو ایکاریہ کا پایۂ تخت ہے، جو پیرس کے مشابہ ہے، اِس میں ایک نہر بھی ہے، جیسا کہ پیرس میں پائی جاتی ہے؛ شہر گول ہے، جسے اُس کی نہر دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتی ہے، دونوں ساحل پر اُن کی نہروں کی حفاظت کے لئے پتھر کی دو مضبوط دیواریں ہیں نہر اِس قدر کھودی گئی ہے، کہ اس کی پہنائیاں دُور تک چلی گئی ہیں۔ چنانچہ اُس کے اندر اوقیانوسی کشتیاں چلتی ہیں، اور مال واسباب کو ایکار تک پہونچاتی ہیں، اِس شہر میں نہر کے متوازی پچاس راستے ہیں اور دوسرے پچاس راستے اِس کو قطع کرتے ہیں، نہر کو طریق عشریہ پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ شہر گول ہے، اِس لئے اُس کی گولائی اور اِن راستوں کا نظام کیسے موافقت کر سکتا ہے؟ شہر ۶۰ حصّوں میں منقسم ہے، اُن میں سے ہر ایک میں ایک مدرسہ، ہسپتال، عبادت گاہ اور شراب خانے پائے جاتے ہیں شہر میں عمارتیں بنائی گئی ہیں، ہر عمارت پندرہ منزلہ ہے، اِس کے گرد وپیش ایک باغ عامہ (. . . . .) پایا جاتا ہے۔

اِقلیم "ایکاریہ" میں دیہات شہر کی حیثیت رکھتے ہیں، کابیہ نے حفظانِ صحت کے اُصول کی نگہداشت اور سڑکوں کی آرائش پر بہت زور صرف کیا ہے، چنانچہ سڑکوں کے دونوں کنارے شیشوں سے ڈھکے

ہوئے ہیں، اِس طرح اِسٹیشنوں پر بھی شیشے سائبان کا کام دیتے ہیں (کیا آج کل اِس طرح نہیں ہے؟) اصطبل، مذابح، اور شفاخانے شہر یا دیہات کے باہر واقع ہیں، کارخانے اور مخازن نہر یا ریل کی پٹڑیوں کے قریب واقع ہیں، تاکہ اسباب کی نقل و حرکت میں سہولت ہو۔

اب ہم کو اس قانون اور نظام میں غور کرنے کی ضرورت ہے، جس پہ باشندگانِ ایکاریہ کاربند ہیں۔

اتین کابیہ وہ شخص ہے، جو اپنے زمانے کی سوسائٹی اور ماحول سے بیزار تھا، نپولین جیسا زبردست شخص اُس پر حکمران تھا، اِس لئے کابیہ نے اپنے خواب کی ابتداء اِس طرح کی ہے کہ اس نے "ایکاریہ" کے لئے ایک مقتدر، اِستبداد پسند امیر کا تخیل پیش کیا، جو اپنی حکومت کے نظام پر لوگوں کو چلائے، کوئی شخص اُس کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکے، اِس نظام کو واضح کرنے والی بہترین چیز یہاں کے باشندوں کی زندگی کا اعلیٰ وصف ہو۔

اِیکاری اپنا دن صبح سویرے چھ بجے سے شروع کرتا ہے، ہوٹل یا کارخانہ میں ناشتہ کرتا ہے، مختلف ناشتے اہل فن کی ایک ماہر جماعت تیار کرتی ہے، جس میں ناشتہ کھانے والوں کی صحت اور اُن کے مزاج کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اِس قسم کے انتظام میں ایک قسم کا خلل اور خلجان ہے، وہ یہ کہ کیا اہل فن کے خلاف کوئی چیز جائز نہیں؟ یہی شک و شبہ

کابیہ کو بھی درپیش ہوا، چنانچہ اُس نے باشندوں کے لئے اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں اور جس وقت چاہیں ناشتہ کر سکتے ہیں، جب ایک ایکاری ناشتہ کر چکتا ہے، تو اپنے کاروبار کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، موسم گرما میں سات گھنٹے اور سرما میں چھ گھنٹے کام کرتا ہے، سرد ممالک کا باشندہ ہمارے یہاں کے ملک کے دستور کے برعکس گرمی کے زمانے میں کام سے آرام پاتا ہے، تمام ایکاریہ کے باشندے بلا امتیاز انہی مقررہ ساعتوں میں کام انجام دیتے ہیں۔

کارخانے حکومت کے ہاتھوں میں ہیں، حکومت ہی اوقات عمل کا تعین کرتی ہے، اور یہی گھوڑوں اور سواریوں کی بھی مالک ہے، جو ساز و سامان کو اٹھاتے ہیں۔ یہ ایسی اشتراکیت ہے، جس میں کسی قسم کے مکر و فریب کا شائبہ نہیں پایا جاتا، "ایکاریہ کا سفر" نامی کتاب، جو ۱۸۴۵ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی، اس وقت سے اکثر و بیشتر مزدوروں کے ہاتھوں میں پہونچتی رہی، یہ کتاب یورپ کے مزدور طبقہ میں اشتراکیت کی تحریکات اور افکار کو پھیلانے اور انقلابی عناصر کو پرورش کرنے میں نہایت موثر ثابت ہوئی۔

جب ایکاری اپنے کام سے فراغت حاصل کر لیتا ہے، تو اپنا لباس اُتار دیتا ہے۔ یہ لباس "مجلس پارچہ جات" اسی نہج پر تیار کرتی ہے،

جس طرح ایک اِدارۂ جیش فوجیوں کے کپڑے بناتا ہے، دَرحقیقت اہلِ ایکاریہ ایک لشکر ہیں۔ جو صنعت و حرفت کے لئے تیار کئے گئے ہیں، اُن کے تمام شعبوں اور حالتوں پر نظامِ جیش ہی نافذ کیا جاتا ہے۔

اِیکاری کو بچپن ہی سے اُس کی ماں حقوق و فرائض مادری کے اَسباق سکھاتی ہے، جب وہ پانچ سال کا ہو جاتا ہے، تو حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی تربیت کرتی ہے، یہی اِنتظام اِیکاریہ کے تمام جوانوں میں مردوں کے لئے اٹھارہ سال اور عورتوں کے لئے سترہ سال کی عُمر تک قائم رکھا جاتا ہے، ہر جوان مَرد اور دوشیزہ کو مخصوص تعلیم دی جاتی ہے، جو اِس صنعت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے، جس کو آئندہ اُنھیں اِختیار کرنا پڑے گا، یہ صناعات محدود و معین ہیں، جو تمام کے تمام ایک ایسی جماعت کے سپرد ہیں، جو ہر سال تمام کارخانہ میں کاریگروں کا شمار کرتی ہے، جمع شدہ اَسباب و مصنوعات کی مقدار کا اندازہ کرتی اور جائزہ لیتی ہے، پھر ہر صنعت میں جس قدر کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے، اُن کو مقرر کرتی اور ضرورت کے مطابق اِن نوجوان مردوں، اور عورتوں کا اِنتخاب کرتی ہے، جو مدارس سے فارغ ہوتے ہیں، مرد کو ۶۵ سال کی عمر میں اور عورت کو ۵۰ سال کی عمر میں کام سے برطرف کر دیا

جاتا ہے۔

ایک ایکاری بیس سال سے پہلے شادی نہیں کرسکتا، لیکن عورت کو اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کی اجازت ہے، حکومت اپنے ابتدائی دَور میں استبدادی ہے، کیوں کہ کابیہ نے "ایکار" کے لئے ایسی شخصیت کا تخیّل پیش کیا ہے، جو نپولین جیسا ارادہ اور قوت رکھنے والا ہو تاکہ وہ اُس کے ذریعہ سے ہر قسم کی اصلاح کا کام انجام دے، لیکن اُس کی وفات کے بعد حکومت نیابی ہو گئی۔ ہر شہر کے لئے ایک کمیٹی ہے اور تمام اقلیم کے لئے انہی کمیٹیوں میں سے ایک مجلس منتخب کی جاتی ہے، اُس کے لئے ایسی نفاذی قوت ہے، جو تمام ملکوں کے انتظامات کو انجام دیتی ہے، حکومت خود اخبار و رسائل جاری کرتی ہے، لیکن یہ رسائل محض خبروں کے شایع کرنے تک محدود ہوتے ہیں اُن میں کسی قسم کی رائے زنی نہیں ہوتی، مبادا اس کے ذریعہ سے حکومت کے قدم مضبوط ہو جائیں۔

جو شخص "ایکاریہ کا سفر" کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ کس طرح حکومت استبدادی تمام کارخانوں، مدرسوں اور اخبار و رسائل کو اپنے قبضہ میں کئے ہوئے تھی، تو ایسا محسوس کرے گا کہ گویا روس میں اشتراکیت کی جدید تاریخ پڑھ رہا ہے، درحقیقت آج روس میں اشتراکیوں کی

زندگی انیسویں صدی کے عجیب وغریب خوابوں کی تعبیر اور ان کا آئینہ دار ہے، روس کی فلاح وبہبودی ان خوابوں کی رہین منت ہے، جن کی مثال تاریخ کے صفحات میں مشکل سے ملسکتی ہے۔

بیسویں صدی

ایڈورڈ بلامی کا خواب (۱۸۵۰ء ۔ ۱۸۹۸ء)

رابرٹ اوین اور اتین کابیہ یہ دونوں اشتراکی تھے۔ جن کے تخیلات بیدار اور خواب مدبرانہ ہوتے، پھر ہر ایک اُن کی تعبیر و عمل کے لئے جد وجہد کرتا تھا، ان دونوں نے انگلستان اور امریکہ میں اپنے نظریات کے تجربہ اور تخیلات کی تحقیق کے لئے ایک عمارت بنائی تھی۔

لیکن ایڈورڈ بلامی کا حال اُن جیسا نہیں، وہ دونوں مصلح تھے، جو عمران، مصنوعات اور مزدوروں کے احوال کے بارے میں تعلیمات و نظریات پیش کیا کرتے تھے، بلامی ایک امریکی ادیب تھا، جس نے اشتراکیت کو اپنا مطمح نظر بنا کر اس سے ربط و ضبط پیدا کیا، چنانچہ اس نے

اپنا ناول "عالم پر ایک نظر" لکھا، اس میں وہ عالم کے متعلق آج سے دو ہزار پیشتر کے تخیلات بیان کرتا ہے، اپنی گذشتہ صدیوں کی روشنی میں ہمارے موجودہ حالات پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے، اِن تمام میں ایک ماہر اور حاذق ناول نگار ادیب کا رنگ جھلکتا ہے، اِسی لئے اس کا یہ ناول جمہور انگلستان و امریکہ اور بالخصوص مزدور طبقہ کے پاس ہمیشہ مقبول رہا۔

وہ اپنا افسانہ اِس طرح شروع کرتا ہے کہ ایک شخص کو تنویم مقناطیسی سے بے ہوش کردیا جاتا ہے، اور وہ بیسویں صدی میں بیدار ہوتا ہے۔ ۱۸۸۸ء میں اس کو ایک دوشیزہ عورت سے عشق ہوجاتا ہے، وہ اپنی قدیم عاشقانہ داستان اپنے پوتوں کو بیسویں صدی میں سُناتا ہے، ہم کو اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہماری غرض صرف اِتنی ہے کہ اس نے جن اِصلاحی و اِنقلابی نظریات کو پیش کیا ہے، بے کم و کاست بیان کردیں۔"

بلامی نے کوئی ایسی بڑی چیز پیش نہیں کی، جو قابل اِعتناء و توجہ ہو، ہاں اس کے بیان میں ہیجان انگیزی اور مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے، اگر متانت اور سنجیدگی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کی عبارت نہایت لطیف و دقیق ہے، اور اکثر و بیشتر ادعائی،

اگر ہم اس کے ناول کا مطالعہ کریں تو اس کا ادب ہم کو معراجِ تخیل تک لے جائے گا، اور اس کا بلند ارادہ عواطف و جذبات کی بلند چوٹیوں تک پہنچا دے گا، لیکن ذرا غور و تامل کیا جائے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا بلامی ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کاغذی شہر پیش کر رہا ہے؛ افلاطون کا تخیل باوجود سادہ اور سلیس ہونے کے بلامی کے اس خواب سے، جو بیسویں صدی کے اواخر میں دیکھا جاتا ہے، اپنے اندر ٹھوس نظام اور سنجیدہ نظریات رکھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان شریف جذبات و احساسات کا شعور ہونے لگتا ہے۔ جو بلامی کو اس تخیل کے پیش کرنیکا باعث ہوئے۔

بلامی کو ایسی سوسائٹی کے دیکھنے کی تمنا ہے، جس کا ہر فرد دسترخوان پر بیٹھے ہوئے بہترین غذائیں کھائے اور اس کے قریب کوئی ایسا شخص نہ ہو، جو اس کی اس نعمت پر حسد کرتا ہو اور بھوک سے بے قرار و بے تاب ہو ——— بلامی کی آرزو یہ ہے، کہ تعلیم و تربیت عام ہو، ہر شخص اس سے مستفید ہو، اس لئے کہ جہالت کے برے اثرات تمام افرادِ جماعت پر منعکس ہو کر ماحول کو مسموم بنا دیتے ہیں، ہاں طبقۂ جہال کو ایسے کام کا بوجھ بھی اٹھانا چاہیئے جو مہتروں اور جاروب کشوں وغیرہ کے طبقہ کے ساتھ خاص ہیں، کیونکہ اس قسم کے کام صرف ایک جماعت کیلئے

نہایت تکلیف دہ اور شفقت رساں ہوتے ہیں، ـــــ بلامی دولت وثروت میں تمام اِنسانوں کو مساوی دیکھنا چاہتا ہے، دولت کی اِس قدر فراوانی نہ ہو جائے کہ بعض کو ملے اور بعض محروم ہو جائیں، اِس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ادیب ہے، اس کی آرزو یہ ہے کہ عشق ومحبت کی کسی طرح توہین نہ کی جائے، قصابوں، بنیوں یا درزیوں کے باہمی اِمتیازات اور رسم ورواج اِس عاشق مزاج نوجوان اور دوشیزہ کے درمیان سدّ راہ نہ ہونے پائیں جو باہم رضامندی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، کیونکہ نوجوان میں اِتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ عورت کی جملہ ضروری اشیاء خرید سکے، ـــــ بلامی لوگوں میں سادہ زندگی دیکھنے کا متمنی ہے، وہ ان کو تکلف وتصنع سے باز رکھنا چاہتا ہے، دوشیزہ پر اپنے شوہر کی محبت کا دَم بھرنا اور سادہ لباس پہننا فرض ہے، یہ بھی اس پر ضروری ہے کہ وہ بلا قید وبند اور بغیر کسی شرم وحجاب کے لوگوں کو مفید مشورہ ورائے دے۔

بلامی کی یہ تمام آرزوئیں اور تمنائیں اپنی جگہ دُرست اور صحیح ہیں، مگر جہاں وہ اُن کے منظرِ عام پر آنے کا اِرادہ کرتا ہے، تو اُس کا تخیل غلط اور ناکام ثابت ہوتا ہے، ہم کو یہاں تھوڑی دیر کے لئے توقف کرنا ضروری ہے، تاکہ ہم افلاطون کے تخیل اور انیسویں صدی کے خواب بیں اصحاب کے تخیلات کے درمیان موازنہ کریں، کیونکہ افلاطون نے طبقۂ مزدور پر

کوئی توجہ صرف نہیں کی، بلکہ اُن کو انہی کے حال پر چھوڑ دیا، بخلاف اس کے گذشتہ صدی کے تمام فلسفیوں نے جہاں سوسائٹی کی اصلاح کے بارے میں غور و فکر کیا، وہاں طبقۂ مزدور کے مسئلہ کو تمام مسائل پر مقدم رکھا، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ موجودہ زمانے میں مزدوروں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ خود جمہور قوم کی شکل اختیار کر چکے ہیں، لیکن گذشتہ جماعتوں کا حال اُس کے برعکس تھا، اس کا اصل سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آلات و ایجادات میں اضافہ ہو گیا، ایک قلیل جماعت کے ہاتھ میں دولت و ثروت آ گئی، اور ادنیٰ سرمایہ دار کو بڑے سرمایہ دار سے شکست کھانی پڑی یہی حال بلامی کا ہے کہ وہ اپنی خوش حالی یا سوسائٹی کا اصلاحی نظام طبقۂ عمال کے مسئلہ سے شروع کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ "انیسویں صدی میں ولایات متحدہ کے باشندوں نے بڑی بڑی مشترکہ انجمنوں کے ذریعہ اپنے کاموں کی تنظیم کی تھی، جوں ہی یہ صدی ختم ہونے کے قریب پہونچی، تمام مشترکہ انجمنوں نے ایک ادارہ کی شکل اختیار کر لی اور ایک قسم کی حکومت کی تشکیل عمل میں آئی، ان جماعتوں میں کام کرنے والے مزدور بہت بڑے لشکر کی شکل بن گئے، جن میں تمام نوجوانان قوم داخل کر دیئے جاتے تھے، یہ فوج کی طرح کام کرتے، ان پر حکومت کا اقتدار رہتا اور اسی کا نظام و دستور نافذ کیا جاتا، اور اجرت

بھی حکومت ہی سے حاصل کی جاتی، اِس فوج میں کام کرنا ضروری ہے، جیسا کہ موجودہ لشکروں میں دستور رہے، جب ایک نوجوان فوجی تعلیم گاہ سے فراغت پاکر نکلتا ہے، تو تین سال تک لشکر کے انتظامی اُمور و فرائض انجام دیتا ہے یہاں اس کو مقررہ سخت کام کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو جاتی ہے، تو کسی صنعت یا کسی فن کو، جس کا اعلان اس وقت حکومت مزدوروں کی حاجت کو محسوس کرتے ہوئے کرتی ہے، اختیار کرنے کے لئے پیش قدمی کرتا ہے، چنانچہ تیس برس کی عمر تک اس فن یا صنعت کی مشق کرتا ہے، حکومت کے مختلف مدارس اس کو اس میں ماہر اور لائق بناتے ہیں، اس کے بعد یہ طبقۂ مزدور کے بڑے لشکر میں، جس کو حکومت چلاتی ہے، لشکری کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، ہر مزدور خواہ وہ کتنا ہی محنتی ہو یہ اور دیگر مزدور سالانہ ...۸ جنیہات (گنی) مساوی طور پر لیتے ہیں، اِس میں ہشیار اور سست مزدور کا امتیاز نہیں کیا جاتا، جو شخص اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے، سزا کا مستحق ہوگا، چونکہ صعوبت اور سہولت کے لحاظ سے کام مختلف ہیں، اس لئے حکومت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ مشکل کاموں کے لئے مدت میں اضافہ اور آسان کاموں کے لئے مدت میں کمی کر دی جاتی ہے، اس کے باوجود ان دونوں کی اُجرت مساوی ہے مزدور کو اس امر کی اجازت ہے کہ جب وہ ۴۳ برس کا ہو جائے تو کام سے

رُک سکتا ہے اور سالانہ ۴۰۰ جنیہ حاصل کرلے، یا یہ کہ وہ ۴۵ سال تک کام پر برقرار رہے اور اس کے بعد اگر علیحدہ ہونا چاہے تو اپنی زندگی گذارنے کے لئے پوری اُجرت ۸۰۰ جنیہ حاصل کرے؛

اس لشکر میں ایک سہولت یہ ہے کہ افراد کے ماسوا جو علمی و تصنیفی مشاغل میں منہمک ہیں، ہر ایک نوجوان پر کام کرنا فرض ہے، کیونکہ قانون سازی اور تصنیف و تالیف یہ دونوں اس نظام سے خارج ہیں، ایک عالم یا محقق و ادیب کو اس امر کی اجازت ہے کہ وہ آزادی و بے باکی سے اپنی صنعت کو جاری رکھے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے اور جمہور سے جس قدر چاہے اس کا منافعہ حاصل کرے؛

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلامی نے، جو ایک ناول نگار مصنف ہے، اپنی صناعت کے وہ اسرار و رموز معلوم کرلئے، جو اُسے حکومت پر عدم اعتماد کی دعوت دیتے ہیں، کیونکہ حکومت اپنے طبعی وجود کو برقرار رکھنے کے سبب سے جمود و سکون اور موجودہ حالت کو باقی رکھنے کی طرف مائل ہوتی ہے، بخلاف اس کے ایک موجد اور اختراع پسند اور ایک محقق و ادیب کی صناعت و فن کاری کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک سماج کی بندشوں کو توڑ کر غلط رسم و رواج کی سرحد سے پار ہو جانا چاہتا ہے اور حیاتی ارتقائی منازل طے کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، چونکہ حکومت کے اندر ان سبھوں کی

نظروں میں وہ صالح اور بلند مقام نہیں ملتا، جس میں یہ اپنے اذہان و نفوس کے جوہر چمکا سکیں، اس لئے یہ حکومت کو مخدوش نگاہوں سے دیکھتے اور اُس کے آئین و قوانین کو اپنی ترقی کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں۔

اب ہم "جیش عمال" کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء کی حکومت کے تمام اعمال دس مصلحتوں میں تقسیم پذیر ہیں، ہر دائرۂ مصلحت میں ہم جنس مصنوعات کی ایک جماعت شامل ہے، ہر صناعت کا خاص دفتر اور مخصوص کاغذات اور مہریں ہیں، جو کچھ روپیہ بچتا ہے، اُن آلات و عمارات میں لگا دیا جاتا ہے۔ جن کی یہ صناعت محتاج ہے، یہی دفتر مصنوعات اور دیگر ساز و سامان کے نرخ مقرر کرتا ہے، لیکن وہ اِستبداد سے کام نہیں لے سکتا، کیونکہ حکومت کا قانون سوائے حدِ معین کے قیمتوں میں اِضافہ کرنے سے روکتا ہے۔

جیش عمال کی سیادت ولایاتِ متحدہ کا وہ رئیس انجام دیتا ہے، جس کو جیش عمال کے سوا تمام باشندے اِنتخاب کرتے ہیں، اُس کے فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ باشندوں کو فوجیوں کے ظلم و اِستبداد سے محفوظ رکھے، مگر یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا یہ جیش کثیر اِس بات پر رضامند ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے ایسا رئیس و صدر منتخب کیا جائے جس کے اِنتخاب میں اُنکی رائے و مرضی کو دخل نہو؟ کیا رئیس، جو اُن کی رضامندی کے بغیر اِنتخاب کیا گیا ہے، مزدوروں کی خوش حالی میں اِضافہ کرنے کے لئے کچھ کام کر سکتا ہے؟

پھر اس امر میں بھی شک ہے کہ جیش کامل کا ادارہ ایک ایسی وسیع قوم کے جملہ امور انجام دے سکے، جس کے افراد کی تعداد دس کروڑ تک پہونچتی ہے کیونکہ اس قسم کی حکومتی اشتراکیت سے یہ امر بعید از قیاس ہے، کہ وہ تمام مصنوعات کو انجام دے، ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض صناعات جو افراد کے ہاتھوں میں کامیاب ہوتی ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر حکومتی اشتراکیت بلکہ ہیروقراطیہ اشتراکیت کے طریقہ پر زیادہ کامیاب ہو جاتی ہیں، جیسا کہ ہم مصری ریلوے لائن میں ملاحظہ کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی صناعات بھی ہیں، جو اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی ہیں، جب تک وہ ایک چھوٹے پیمانہ پر اور محدود المساحۃ اداروں میں نہ چلائی جائیں۔ ہر مقام کے لئے ایسی شخصیت ہو۔ جو ان مصنوعات میں کمال پیدا کر کے ان کو منظر عام پر لائے، ہر جماعت کا ایک نگرانکار ہو، جو اس پیشہ ور کی دیکھ بھال کرتا رہے جو کسی صناعت کی مشق کرتا ہے، پس حکومتی اشتراکیت ہر صنعتی میدان میں کامیاب ثابت نہیں ہو سکتی، اس لئے اشتراکیوں کے درمیان ایک نئی جماعت پیدا ہوئی، جس نے اشتراکیت بلدیہ ....

.... کا نظریہ پیش کیا، جہاں پر بلدیات (.......... وہ کام انجام دیں جن کو افراد بر اہ راست حکومت میں انجام دیا کرتے ہیں۔

اب ہم اِس حیاتِ اجتماعیہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں، جس کا تخیل بلامی نے پیش کیا ہے، ہم اُس کی خوش حالی میں آرام پسندوں اور عیش پرستوں کی ایک بہت بڑی جماعت پاتے ہیں، جو اپنے عیش و عشرت میں بدمست ہیں، اور آفاقِ عالم میں اپنی اِس کثیر رقم سے سیر و تفریح کرتے ہیں، جس کو وہ کسی صناعت کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، یا خود اپنی محنت سے کماتے ہیں، یہاں بلامی ریاضت و محنت پر زیادہ زور صرف کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

"روٹی اگر زندگی کی اہم ضرورتوں میں پہلا درجہ رکھتی ہے
تو ریاضت اور کوشش دوسرا درجہ"

ایک اور بڑی جماعت جیشِ عمال کی ہے، جس میں ہر فرد اپنے ۲۴ برس صرف کرتا ہے، اس پر بہر صورت کام کرنا لازمی ہے، اگر وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں سستی اور کوتاہی کرے تو سزا کا مستحق ہوگا۔ ہمارے اِعتقاد میں بلامی کا یہ نظریہ سوسائٹی کی عمارت کا ایک بے بنیاد رکن ہے، کیوں کہ یہ مدت جس کو ایک اِنسان رضامندی سے برداشت کرتا ہے۔ نہایت طویل ہے:۔

ہر خاندان کے لئے ایک مسکن ہے، لیکن وہ پکانے سے بے نیاز ہے، اس لئے کہ ہر جماعت یا شہر کے بعض قبیلوں کے لئے ایک بڑا ہوٹل ہے، اِس میں ہر خاندان کے لئے وسیع مخصوص کمرے ہیں، منزل میں ایک ٹیلیفون ہے جو نہ صرف

گفتگو اور تقریر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے سُرود موسیقی کا بھی
کام لیا جاتا ہے، اِس مقصد کے لئے ایک بوق لگا ہوا ہے، جو آواز کو بلند
اور زوردار کرتا ہے، چنانچہ یہاں ایک مقررہ ساعت میں خاندان جمع ہوتا ہے
اور واعظوں، مقرروں کے وعظ، لکچر اور مُطربوں اور مغنیوں کے گانے
سنتا ہے، بلامی نے ریڈیو کی ایک ایجادی جھلک دکھائی ہے، جو آج کل تمام
ممالک میں ہر جگہ پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آرہی ہے، کیا یہ بلامی
کے دیرینہ خواب کی دلکش تعبیر نہیں؟!!!

تین انگریز

موریس (۱۸۳۴ء تا ۱۸۹۶ء)

ہیڈسن (۱۸۶۱ء تا ۱۹۲۴ء)

ولز (۱۹۰۶ء)

المانوی جسم اور فرانسیسی دماغ شاعر ہنریخ ھینہ کو ہر شخص جانتا ہے، کہ اس نے کس طرح اپنی انقلابی تحریکات کا نقشہ کھینچا ہے اور کیوں کر اس نے شروع میں جمہوری حکومت (.........) کے قائم کرنے پر جرأت آفریں اقدام کیا اور اس کی راہ میں جتنے مصائب اور دشواریاں پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیا، لیکن جب اُس نے دیکھا کہ

جمہوریت عام مخلوق کی سلطنت ہے، تو اُس نے اپنی مدافعت روک لی، دیرینہ شجاعت و جراءت کے بجائے اُس کے دل و دماغ کے گوشوں پر رعب و ہیبت کی گھٹائیں مسلط ہوگئیں۔

گذشتہ صدی جمہوریات کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے کمزور ہو جانے کا بھی دور تھی، پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پبلک کے ہاتھوں میں حکومت آجانے سے استبداد اور ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا، موجودہ صدی کے تلخ ناک تجربات و واقعات سے ظاہر ہو گیا کہ جمہوریت سلطنت کے وقار کو برقرار نہیں رکھ سکتی، اس لئے بیسویں صدی کے ارباب فکر و نظر "دیوتاؤں" کو پیدا کرنے کی طرف مائل ہو گئے، یہ "دیوتا" آسمان سے نازل نہیں ہوتے، بلکہ یہ انسانی گروہ ہی سے اس طریقہ پر پیدا ہوتے ہیں، جس طرح سے کہ افلاطون نے اپنے خواب میں "طبقاتی نظام" یعنی حکام کے ایک جداگانہ طبقہ کو ایجاد کرنے کا تصور پیش کیا ہے، جس کا کام محض یہ ہو کہ وہ شہر کی مصلحتوں اور سلطنت کے امور میں غور و فکر کرتا رہے۔ اس گروہ کے افراد کے لئے نہ کوئی خاندان ہو اور نہ جائدادیں، جو اُن کو خاص مصروفیتوں سے باز رکھیں۔

جس طرح گذشتہ صدی جمہوریات کے ظہور کا دور تھی، اسی طرح اس نظریۂ انقلاب کے ظہور کا بھی مظہر تھی، جس نے نصف صدی سے

عقولِ انسانی میں فکر و نظر کی بجلیاں دوڑانے اور اپنے رنگ میں نظریات کے خاکے، خوابوں اور عمرانی ترسیمات کو پیش کرنے میں، نمایاں حصہ لینا شروع کیا ہے، یہ نظریہ عمرانی نقطۂ نگاہ سے اس طور پر حاصل کیا گیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ انسان ترقی کرتے کرتے ایک دن "دیوتا" بن جائے جیسا کہ "نظریۂ ارتقاء" کے مطابق گذشتہ زمانے میں انسان حیوانوں کی منزل سے گذر کر ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے اپنی موجودہ شکل میں تبدیل ہو گیا ہے، یہ نظریہ اپنے ارتقائی منظر کی طرف دعوت دینے اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کی نسبت مغربی ہے، اس لئے یہ امر ہمارے لئے موجب استعجاب نہیں کہ تین فیلسوف اور مفکر انگریزوں نے انتخاب صناعی کو ایجاد کرنے کا خواب دیکھا ہو، یہ انتخاب لوگوں میں ایک اونچے طبقہ کے وجود کو پیش کرتا ہے، جس کی ترقی سے سوسائٹی کے حال کی اصلاح نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ جس سوسائٹی میں یہ طبقہ زندگی بسر کرتا ہے اس کے جسم و ذہن میں ترقی ہو۔

"شو" نے بھی یہی خواب دیکھا ہے، جس کا بیان یہاں لا طائل ہے اس لئے کہ اس نے مکمل خوش حالی کو پیش کرنے کی بجائے اعتراضات اور شبہات کا ایک انبار لگا دیا ہے، ولز اور ہیڈسن نے بھی یہی خواب دیکھے ہیں، ان دونوں کے ذہن نظریۂ انقلاب کے اثر سے سیراب تھے

ولز نے اپنی حیات ادبی "تشریح خرگوش" کی تالیف سے شروع کی اور اب ان دیوتاؤں کے متعلق تصنیف کرتا ہے، جو انسانی جسم سے حیوانیت کے میل کچیل سے صاف ستھرا ہو کر پیدا ہوتا ہے۔

ہیڈسن (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۲۲ء) نے انگریزی ادب کی حیاتِ نو کا دروازہ کھولا، وہ اُن جدت پسند ادیبوں کی جماعت میں سے ہے، جو مستقبل میں بکثرت پیدا ہوں گے، جن کے اَدبی جواہر پاروں سے علوم و فنون کے دامن مالامال نظر آئیں گے، جن کا پایہ فنونِ ادب میں بلند ہوگا' ہیڈسن بلی، کوا، شیر، انسان، پہاڑوں نہروں اور دیگر قدرتی مظاہر اور ملکوت ارضی کے عظیم الشان اجسام کے تشریحی دلکشانی امور اپنی برق آسا تشبیہات واستعارات اور بلیغ و نغمہ ریز الفاظ میں پیش کرتا ہے، جن کو اس سے قبل عرب کے تشریح داں ادیبوں نے اپنی دوربین نگاہوں سے دریافت کر کے ہمارے لئے علوم و معارف کا بیش بہا سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ولز اور ہیڈسن کی خوشحالیوں کا بیان کریں، مناسب خیال کرتے ہیں، کہ ان خوش حال تخیلات پر ایک سرسری نظر دوڑالیں، جو اُنیسویں صدی کی پیداوار ہیں، اس سے ہماری مراد موریس کی خوش حالی ہے، کیونکہ یہ بیسویں صدی کی بہ نسبت اُنیسویں صدی

سے مشابہت رکھتی ہے، موریس اشتراکی تھا، اُس نے یہ مذہب فنی مصلحتوں کی وجہ سے اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اُس نے دیکھا کہ موجودہ اقتصادی نظام جس میں شدید مصائب اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے پیشہ ور طبقہ کو نکمی، خراب اور ہلکی مصنوعات کے بنانے پر آمادہ کرتا ہے، تاکہ ارزانی کی وجہ سے بازار میں بآسانی رواج پا سکیں۔ موریس نے اس امر کا بھی مشاہدہ کیا کہ کارخانہ کا مالک اپنے مزدوروں پر کام کا اِس قدر بوجھ ڈال دیتا ہے، کہ وہ طویل ساعات تک کام کرتے ہیں، باوجود اِس کے وہ قلیل تنخواہ پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت فقر و فاقہ اور تنگدستی و ذلت کی زندگی گذارنے پر مجبور رہیں۔

ہیڈسن بذات خود بیدار مغز، شایستہ اور لطیف مذاق واقع ہوا تھا، ریشمی مہین لباس پہنتا اور کتابوں کی جلدوں پر سنہری حروف بناتا تھا، چنانچہ ہیڈسن کے دِل میں اشتراکیت کا جذبہ جوش مارنے لگا اُس کے یہ جذبات بعینہٖ اُس شخص کی طرح ہیں جس کا نفس لطافت پسند اور جود و سخا سے آراستہ ہے، وہ اپنے گھر میں عیش و مسرت اور تجمل و شکوہ کے جو رنگین لمحات دیکھتا ہے، اسی قسم کے جلوے اپنے شہر میں بھی دیکھنے کا آرزومند ہے، جو تہذیب و ثقافت اپنے اندر پاتا ہے اسی طرح کی تہذیب و شائستگی تمام اِنسانوں میں پائے جانے کے لئے

بے قرار رہتا ہے، اُس کی تمنا یہ ہے کہ جو ریشمی لباس وہ خود پہنتا ہے، لوگ بھی پہنیں، یہ جس طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے، عوام بھی اسی طرح خوشگوار زندگی بسر کریں، اِسی قسم کی کشش وجاذبیت دل و دماغ کو حسین و دِل فریب خوابوں کو دیکھنے کے لیئے آمادہ کر چکی ہوتی، اگر ایک اِشتراکی کی عقل و ذہن میں اِشتراکیت پر قناعت کرنے اور اُس کے خوابوں پر رضامند ہونے کا شائبہ نہ پایا جاتا، کیونکہ اِشتراکیت کی خواہ کتنی بھی خوبیاں بیان کی جائیں اُس کے اندر بنیادی نقائص ضرور موجود ہیں جو اب تک اِشتراکیوں کی بحث و نظر کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔

موریس (۱۸۳۴ء - ۱۸۹۶ء) اپنے خواب کی ابتداء ہی خوش حالی کے بیان سے اِس طرح کرتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے اِنقلابات کے بعد معائب و نقائص سے بھرا خوش حالی کا ظہور ہوا، اُس نے دیکھا کہ بعض لوگ دولت و سرمایہ اِس طرح جمع کرتے ہیں، جیسا کہ عجائب اور آثارِ قدیمہ جمع کئے جاتے ہیں، جن کا مقصد معاملہ نہیں ہوتا، عورتیں صحت و عافیت میں گذشتہ صدی کی ان عورتوں کے برعکس نظر آتی ہیں، جن میں شجاعت و مردانگی، جہاد و مشقت کے آثار و علامات پائے جاتے تھے، یہاں زندگی بہت سادہ ہے، کیونکہ لوگ عارضی مال و

دولت اور ساز و سامان سے بے نیاز ہیں، جن کو پہلے باہمی سبقت اور فخر و مباہات کا آلہ سمجھا جاتا تھا۔

اسی لئے وہ بھاری کام نہیں کرتے، ان کو اپنے کام انجام دینے کے لئے کسی قسم کی مشقت برداشت نہیں کرنی پڑتی، کیونکہ ان کی ضروریات تھوڑی ہیں اور تھوڑا سا کام ان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کافی ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ دستی مصنوعات کی طرف عام میلان پایا جاتا ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ لوگ آلات و اوزار سے بے نیاز ہیں، بلکہ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ ہاتھ سے تیار کیا ہوا کپڑا بہ نسبت آلہ کے ذریعہ بنے ہوئے کپڑے کے اچھا اور اس سے مضبوط ہوتا ہے؛ کاریگر اس پر خاص نظر صرف کرتا ہے، لیکن اس کی مثال دیگر مصنوعات کی بڑی تعداد میں کم پائی جاتی ہے، پھر وہ کاریگر جو دستی مصنوعات بناتا ہے: شروع میں اُن کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے پائے تکمیل تک پہونچاتا ہے، اس میں اس کو وہ لذت ملتی ہے، جو ایک ماں کو اپنے فرزند کی تربیت میں یا ایک مؤلف کو اپنی کتاب تالیف کرنے میں حاصل ہوتی ہے، کیونکہ یہ اپنے دل میں وہ لذت و سرور محسوس کرتا ہے جو ایک نئی چیز کے موجد کے لئے ہوتا ہے، بخلاف اس کے ہم آج کل بڑے بڑے کارخانوں میں دیکھتے ہیں کہ ہر کاریگر اور مزدور

اپنا کام مخصوص کرلیتا ہے، اِس سے تجاوز نہیں کرتا، بادل ناخواستہ کام کرتا ہے اور اس پر وہ معتدبہ اُجرت حاصل کرتا ہے۔

علاوہ اس کے وہ سادگی جو اِس امر کو مقتضی ہے کہ دستی مصنوعات اور ضروریات کو کم کردینے کی طرف دعوت دے، اِس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ بڑے بڑے شہروں کو اُجاڑ دیا جائے، سوسائیٹیوں اور بڑے بڑے ملکوں سے بے نیاز کردے، کیونکہ ہر شہر اپنی حسب ضروریات پیداوار حاصل کرلیتا ہے، عظیم الشان لندن کے ٹیلوں میں سوائے پارلیمنٹ کی اس عمارت کے، جو آج چوپائیوں کی سیر و تفریح کا مرکز بنی ہوئی ہے، اور کوئی چیز باقی نہیں رہی، مزدور بہت کم کام کرتا ہے، مگر فن کو ترقی دینے کی فکر میں لگا رہتا ہے، وہ تجارت کی غرض سے کوئی چیز نہیں بناتا، بلکہ وہ اختراع و جدت کی خاطر عمل کرتا ہے، بالفاظ دیگر ہم اِس طرح کہہ سکتے ہیں کہ طامس مور نے اپنا اعلیٰ نظریہ روبہ عمل لانے کے لئے ایسے اشخاص کو منتخب کیا تھا، جو تمام کے تمام عالم، محقق، یا طالب علم ہوں، لیکن ولیم موریس ایسے رجال فن کا تخیل پیش کرتا ہے، جو اپنا اکثر و بیشتر وقت اپنے شہروں کی آرایش و زیبایش، محلات و عمارات کی صناعی و جدت طرازی اور مجسموں اور عجائب گھر - - - - - - - - تعمیر کرنے میں صرف کرتے رہیں۔

سوسائٹی میں سیاسی حکومت یا کسی قسم کا ادارہ نہیں ہے، عدالتیں اور کچہریاں بھی نہیں ہیں، اِس سے یہ مراد نہیں کہ جماعت میں کوئی فرد بغض و حسد رکھنے والا موجود نہیں اور جوش غضب اور جذبۂ عداوت کی وجہ سے جرائم کے اِرتکاب پر آمادہ نہوتا ہو، بلکہ جماعت میں ایسا کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اُن کو سزا نہیں دی جاتی، بلکہ اُن کے ضمیر و وجدان اور اس شرم وحیا پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے، جو عوام کی رائے زنی اور انگشت نمائی سے اُنہیں لاحق ہوتی ہے، اِنگلستان بھر میں تقریباً تیس لاکھ اشخاص سکونت پذیر ہیں مگر آج کل پچاس لاکھ سے زیادہ کی آبادی ہے، اگر باشندوں کی تعداد میں کمی ہو اور بھلائیاں بکثرت ظاہر ہونے لگیں، تو لوگوں کے درمیان نزاعات اور مناقشات کے تقریباً سارے اسباب فنا ہو جاتے ہیں، اس وقت اُن کو ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، کہ بڑے بڑے کارخانوں میں ملازمتوں کے حاصل کرنے کے لئے ہجوم کرنے لگیں، جیسا کہ آج کل دستور ہو گیا ہے؛

اِس سرسری مطالعہ سے قارئین پر یہ امر واضح ہو گیا کہ ہورئیس لوگوں پر بے حد حسنِ ظن رکھتا ہے، اُس کی ہر چیز اشتراکیت پر غالب ہو جاتی ہے، اُسے سوسائٹی کی تشکیل اور نظامِ اجتماعیت کے اُصول و قواعد ایجاد کرنے کی پروا نہیں، اور نہ وہ حکومت کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہتا ہے، بلکہ

اُس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا شہر ہو، جو اپنے اندر بذاتِ خود تمام شعبوں کو چلانے کی قدرت رکھتا ہے، اگر فرضی صورت میں ہم نے یہ تسلیم کر لیا تو یہ اُس وقت تک ممکن ہے، جب تک شہر چھوٹا ہو، اُس کے رہنے والوں کی تعداد ہزار دو ہزار سے زائد نہ ہو، لیکن سوال یہ ہے، کہ کیا ہمیشہ یہی تعداد رہ سکتی ہے؟ عورتوں میں کوئی ایسی عورت نہ ہوگی، جو خرگوشوں کی طرح قابلِ نسل ہو، جو جماعت کی مصلحت کا لحاظ نہ رکھے، کیا انسانوں میں ایسے گروہ بھی نہ ہوں گے، جو ایک ایسے نظام کے محتاج ہوں، جن میں سخت احکام و قوانین نافذ کئے جائیں؟ کیا تعلیم کے لئے کوئی ایسا معقول انتظام نہ ہوگا، جو اور نظام سے مکمل ہو اور اس کو نافذ کرنے کے لئے قوت و اقتدار کی ضرورت ہوگی، جو مختصر حکومتی ادارہ میں تشکیل پذیر ہو سکے؟

لیکن موریس ایک فنی شخص (ARTIST) ہے، وہ ہر چیز میں حسن و جمال، عمارتوں میں آرائش و زیبائش اور مصنوعات میں متانت و سنجیدگی کے دیکھنے کا آرزومند ہے، اُس نے آلات و ایجادات کی فراوانی اور بڑے بڑے کارخانوں کے قائم ہونے کو انیسویں صدی میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مفید نہیں پایا، اس لئے وہ انیسویں صدی کو نہایت حقارت آمیز اور نفرت آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے، کیونکہ اس کے اندر انفرادیت اور مزاحمت کی کشش پائی جاتی ہے، وہ اُن کے مخالف

اشیاء کو دیکھنے کا متمنی ہے، اسی لئے وہ طبعی طور پر اشتراکیت کی طرف مائل ہوتا ہے، اور اس کی تحریک پر زور دینے اور اس کی خوبیاں بیان کرنے میں مبالغہ کرتا ہے جیسا کہ موجودہ صدی کے سرمایہ پرست اصحاب سرمایہ داری کی تائید اور اس کے استحکام میں کیا کرتے ہیں؛

اب ہم ہیڈسن کی جولان گاہ تخیل میں قدم دھرتے ہیں، اولاً جب ہم موریس اور ہیڈسن کے نظریات میں غور و تدبر کرتے ہیں، تو دونوں میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں، موریس عالم ارضی کے متعلق غور و فکر کرنے کا عادی ہے، موجودہ روسی اشتراکیت اسی کے خواب کی رہین منت ہے؛ اور تقریباً اس کے خواب کے مشابہ ہے، اس کی کتاب اب تک مقدس انجیلوں میں شمار کی جاتی ہے —— ہیڈسن کائناتِ سماوی میں اپنی توجہ صرف کرتا ہے اور ہزاروں سال پیشتر کے زمانے میں ہم کو لے جاتا ہے، انیسویں صدی اس لائق ہے کہ اس کی طرف زیادہ التفات کیا جائے اور موریس کی اشتراکیت اس قابل ہے کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے، موریس اس امر میں غور کرتا ہے کہ گذشتہ زمانے میں انسان کس طرح حیوان سے تغیرات و انقلابات کے تدریجی مدارج طے کرتا ہوا انسانی شکل و صورت کا ارتقائی مظہر بنا، اس کے بعد موریس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اسی انسان سے جدید

دیوتا پیدا ہوں؛

اس خواب کی وحدتِ اجتماعیہ ایک بہت بڑا مکان ہے، جس میں دس دروازے ہیں، اس مکان کے لئے اس کی قدیم تاریخ، اُس کے فنون لطیفہ اور اس کے آداب ہیں، گویا یہ ایک چھوٹی حکومت ہے، اس کے قوانین بھی ہیں، جن کی پابندی اس مکان کے باشندے کیا کرتے ہیں، ان قوانین کو نافذ کرنے والا ابو البیت (گھر کا باپ) کہلاتا ہے، اس کو اتنا اقتدار حاصل ہے کہ کوئی فرد کسی جرم کا مرتکب ہو، تو اس کو معزول کر دے، اس گھر کے اطراف کشت زار اور باغ ہیں، یہاں کتے اور گھوڑے بھی ہیں، جن میں زبردست انقلاب رونما ہو گیا ہے اور وہ اس حالت میں ہو گئے ہیں کہ انسان کی باتیں سمجھ لیتے ہیں، اور ادنیٰ اشارے سے اُس کے مقصد و غرض کی تکمیل کر دیتے ہیں، لوگ اسی گھر میں زندگی بسر کرتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک کمرہ ہے، یہ شادی بیاہ سے واقف نہیں ہیں، بلکہ جنسی ضروریات و خواہشات کو اس طرح پورا کر لیتے ہیں کہ اُن سے کوئی اولاد برآمد نہیں ہوتی، کیونکہ نسل کی پیداوار کے حقوق ایک ہی عورت کے ساتھ مخصوص ہیں، یہی گھر کی ملکہ ہے، جیسا کہ ہم شہد کی مکھیوں کے جھتے میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہاں ملکہ یا یعسوب نحل (شہد کی مکھیوں کا بادشاہ) وظیفۂ تناسل یعنی

پیداوار نسل کے فرائض ادا کرتا ہے، چنانچہ جدید خاندان کے افراد اسی کے شمار کئے جاتے ہیں اور دوسروں کی طرف منسوب نہیں ہوتے ——— جب اس گھر کے افراد کو "ماں" (ملکہ) کے انتخاب کا اختیار دیا جاتا ہے تو یہ کسی دوشیزہ عورت کا انتخاب کرکے اُس کو ایک خاص مکتب میں رکھتے ہیں، جہاں یہ اُن اشیاء کے اسرار و رموز معلوم کرتی ہے، جن کو سوائے اُس کے اور باشندوں کو معلوم کرنے کی اجازت نہیں، اس سے ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ باشندے یہ انتخاب اس لئے کرتے ہیں کہ اُس کے اندر ایسے ظاہر اخلاق وصفات پائے جاتے ہیں، جو اس کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے اور وہ اسرار جن کو یہ خاص مکتب میں حاصل کرتی ہے، وظیفۂ تناسل کے ساتھ مخصوص ہیں، اس پر یہ ضروری ہے کہ وہ بہترین مردوں کو منتخب کرے، تاکہ آنے والی نسل اور خاندان کے لئے وہ باپ کہلائے جانے کے قابل ہوں، جو کتابیں یہ پڑھتی ہے، وہ اس فضل و شرف کی صفات کی خبر دیں، جو ایک مرد میں پائی جانا ضروری ہیں تاکہ آنے والے خاندان کے افراد میں سے کسی ایک کو پدری شرف حاصل ہو، انسانیت کے اِس دائرہ میں کوئی فرد ایسا نہیں، جو اپنی ماں کا احترام نہ کرتا ہو، یہ سب کے درمیان زندگی بسر کرتی ہے، اُس کی کسی بات کو رد نہیں کیا جاتا، یہ اپنی زندگی برآورد نسل میں گذارتی ہے، اپنی دورانِ حیات میں گھر کے لئے

تیس یا چالیس افراد منتخب کرلیتی ہے، پھر جب یہ وفات پا جاتی ہے، تو اس کے فرائض کو انجام دینے کے لئے دوسری "ماں" کا انتخاب کر لیا جاتا ہے، اس طرح یہ وسیع گھر یا بڑا خاندان نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہتا ہے، اس میں برے اخلاق وعادات اور مذموم صفات کو دخل نہیں ہوتا، ہمیشہ اعلیٰ صفات باقی رہتی ہیں کیوں کہ "ماں" تناسل اور وراثت کا درس سیکھ جاتی ہے، اور اپنے فرائض و وظائف سے بھی واقف رہتی ہے، کہ کس طرح اپنے گھر کی اصلاح کرے اور ترقی کے مدارج طے کرے، جس شخص کے حسن وجمال، فہم وفراست، قوت وتوانائی، صحت جسمانی، اخلاق ومحاسن، ان میں سے کسی ایک میں بھی نقص وعیب نکل آئے تو عہدۂ ابوۃ (پدری) پر فائز ہونے کا مستحق نہیں، اگرچہ اُسے دوسری عورتوں سے اپنی جسمانی غیر منتج جنسی شہوت پورا کرنیکا حق حاصل ہے ——— اس نظام سے ہم اتنا سمجھتے ہیں کہ اس گھر کے باشندے ۸۰ یا ۱۰۰ اشخاص سے زیادہ نہ ہونے پائیں یہ ایک چھوٹے حکومتی ادارہ کی شکل ہوگی، اس میں بعض علوم وفنون زراعت اور دیگر صناعات کے لئے مخصوص ہیں؛

اس نظام میں کوئی ایسی چیز نہیں، جو انسانی طبیعت کے مخالف ہو، جیسا کہ قارئین کو پہلی نظر میں اس کا وہم ہونے لگتا ہے، کیونکہ خاندان اس "ماں" کے وجود سے موجود رہتا ہے، جو جمیع باشندگان کے درمیان قرابت

کی زنجیر ہے، افراد اپنے معین باپ کو نہیں پہچانتے، اسی لئے شخصی منفعت اور پدری دولت و ثروت اور وراثت کا مسئلہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ افراد خاندان کے درمیان کسی قسم کا مناقشہ یا نزاع باقی نہیں رہتا، شہوت جنسی کے لئے کوئی قید نہیں ہے، تمام افراد اس سے یکساں متمتع ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ کوئی نسل نہ چھوڑیں، اس طرح سے انسان شادی کی ایک دوسری نوعیت سے واقف ہوا جو "ضمد" ( ) کے نام سے مشہور رہی ہے، عرب اس کے عادی تھے، ایشیا میں بھی یہی رسم ہمیشہ تک جاری رہی، جہاں تین یا چار بھائی ایک عورت سے بیاہ کر لیتے اور اولاد بڑے بھائی کی طرف منسوب ہوتی۔

اب ہم ولز کی آخری خوش حالی پر ایک عاجلانہ نظر ڈالتے ہیں:

یہ ایک نئی خوش حالی ہے، جو ۱۹۰۶ء کی جدید پیداوار ہے، ہم ایک اور خوش حالی کو فراموش نہیں کر سکتے، جو اس کے قریب ہی معرض وجود میں آئی، جس کو برناڈ شا نے تمثیلی رنگ میں پیش کیا ہے:

ولز ایک خوش حال مصنف ہے، یہ مختلف تخیلات اور خوابوں کی وادی میں پھرا کرتا ہے، اس کی ہر کتاب بے نظیر اور ہر نظریہ گہرا ہوتا ہے، یہ پہلے مطالعہ کرتا ہے، پھر اس پر غور و فکر کرتا، پھر اس کی تفصیل اور گہرائی میں چلا جاتا ہے،

اور اس قدر اس کے کلیات وجزئیات کو بیان کرتا ہے، کہ گویا وہ محسوس اشیاء کی تصویر پیش کر رہا ہے؛

ہمارے اس عالم کے مانند وہ اپنی خوش حالی کو دوسرے عالم میں خیال کرتا ہے، لیکن اس عالم میں اس کے نظریہ کے موافق قومیں اور جماعتیں باہم مختلف اور جُدا جُدا نہیں ہیں، جو ثقافت وعمران میں مناقشہ کرتی رہیں، بلکہ یہاں ایک ہی قوم ہے، اس کا ایک ہی تمدن ہے، اُس کی ریلوے سڑکوں اور ڈاک خانوں کو ایک عمومی اِدارہ چلاتا ہے، اور یہی عام قوانین نافذ کرتا ہے، اِس عالم کے لئے تاریخ ہے، جو زمین کی تاریخ کے مشابہ ہے، لیکن اُس کی انتہا ان انقلابات پر ہے، جس کو اس جدید نظام نے رونما کیا اور قدیم ممالک کے درمیان حدود کی تفریق مٹا دی؛

یہاں کے باشندے آلات کو انتہائی حد تک استعمال کرتے ہیں وہ اپنے فنون ومعارف میں گذشتہ زمانے کو نہیں دیکھتے، چنانچہ یہاں کی عمارتوں میں کوئی ایسا قدیم طرز نہیں پایا جاتا، جو قدیم تمدن و حضارت کی طرف اشارہ کرتا ہے، زمین اور دیگر ثروت ودولت کے اسباب ووسائل تمام کے لئے عام ملکیت ہیں، جن سے مقامی سوسائیٹیاں فائدہ حاصل کرتی ہیں اور افراد کا اُن کے اندر کسی قسم کا دخل نہیں۔ اِن امور میں جن پر یہاں کے باشندے فخر کر سکتے ہیں؛

سب سے اہم امر یہ ہے کہ ہر فرد کے لئے ایک مہر ہے، جو اس کے نام تحریر، اُس کی انگلیوں کی علامت اور اُن مقامات کے ناموں پر مشتمل ہے، جہاں یہ منتقل ہوتی رہتی ہے، اس مہر سے مقصد یہ ہے کہ فرد کی حالتوں کو پیش کیا جائے اور وراثت اور زندگی میں اس کو اپنی ذمہ داریوں کا سبق دیا جائے، کیونکہ وراثت کا نفاذ اُس کی موت کے بعد ہوتا ہے، جہاں یہ سب چیزیں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

اس عالم میں لوگ چار طبقات میں منقسم ہیں:-

(۱) طبقۂ حکام جس کے ذمہ ادارہ اور احکام کو چلانا ہے۔

(۲) طبقۂ شعریہ، یہ ان مفکرین سے مرکب ہے، جن کے ذمہ خیالات و نظریات پیش کرنا ہے۔

(۳) طبقۂ بلداء ———————— جو مقررہ اعمال انجام دیتا ہے۔

(۴) انحطاط پذیر طبقہ، جس میں جرائم پیشہ اور شراب خوار وغیرہ شریک ہیں، یہ لوگ ایک تنہا دور دراز جزیرہ میں بھیج دیئے جاتے ہیں، جہاں اپنی زندگی کے ایام گذارتے اور تمام لوگوں سے الگ رہ کر اپنی من مانی خواہشات پوری کرتے رہتے ہیں، اگر یہ لوگ یہاں کچھ بھلائی کریں، تو زیادہ زمانے تک زندہ رہتے ہیں، ورنہ اُن کا ٹھکانا عدم ہے، اس لئے کہ جب انسان

ہمیشہ برائی میں مبتلا رہتا ہے، تو اُس کو یہ برائی ہلاکت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے، یہ جماعت کی نسبت مرض بھی ہے اور دوا بھی، کیونکہ یہ برے شخص کو جماعت سے علیحدہ کر دیتی ہے۔

اِن چار طبقات کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے، جس کے ذمہ تعلیم اور اصلاحی اُمور انجام دینا اور نظام عالم کی حفاظت کرنا ہے، یہ جماعت افلاطون کے اس طبقہ سے مشابہ ہے، جو حکماء سے ترکیب پاتا ہے، یہ جماعت "سامرائی" سے پکاری جاتی ہے، ایک سامرائی طویل امتحان اور تجربہ کے بعد انتخاب کیا جاتا ہے، اس کے قوائے عقلیہ و جسمیہ کا جائزہ اس کے عالم شباب میں پچیس سال سے متجاوز عمر میں کیا جاتا ہے، اس کے خور و نوش، لباس اور ریاضت میں ایک نظام مقرر رہتا ہے، ہر سال سامرائی جنگل کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی کتاب، ہتھیار، قلم اور نقد روپیہ وغیرہ نہیں ہوتا، اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جنگل سے اپنی خوراک مہیا کرے اور تنہائی میں غور و فکر کرے، تمام دنیوی متاع سے وہ بالکل الگ کر دیا جاتا ہے، پھر جب وہ دنیوی امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس وقت تک وہ اپنے مزاج میں متانت، اخلاق میں سنجیدگی اور جسم میں صحت و توانائی حاصل کر لیتا ہے، اور اس کی نظر و بصیرت عالم کی مصلحتوں میں وسیع ہو جاتی ہے، جب یہ تمام اوصاف ایک سامرائی

میں جمع ہو جاتے ہیں، تو اُس کی ہر بات قابل تسلیم اور اُس کا ارادہ قابل تنفیذ ہوتا ہے،" کوئی طبقہ اُس کی مخالفت کرنے کی مجال نہیں رکھتا، یہ اپنے نظام میں طبقۂ مسیحی کے مشابہ ہے، جس طرح مشنری گروہ دنیوی خواہشات سے الگ ہو کر مسیحیت کی خدمت کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرتا اور رات دن عبادات میں سرگرم رہتا ہے۔ اُسی طرح ہر سامرائی عالم کی تمام چیزوں کو قربان کر کے اپنی جماعت میں داخل ہوتا ہے تاکہ عالم کی اصلاح اور اُن تعلیمات و قوانین کا فرض پورے طور پر ادا کرتا رہے، جن پر اُس کے ادارہ کو، خواہ وہ جماعت میں ہو یا خاندان میں، عمل درآمد کرنا ضروری ہے!

اِس بیان میں کوئی عجیب و غریب چیز، جو عقل و فہم سے بالاتر ہو، نہیں ہے، اِس لئے کہ جب مذہب میں اِس قدر اقتدار و قوت ہے کہ وہ لوگوں کی ایک جماعت کو اِس بات کے لئے آمادہ کرے کہ وہ عبادت اور اعتکاف کو دُور رکسی معبد میں ادا کرتی رہے اور اولاد اور میراث کی اُلجھنوں سے بے فکر رہے، تو بیسویں صدی کے اصحاب پر یہ اَمر کچھ بعید و ناممکن نہیں کہ اُن کے درمیان رہبانیت

فروغ پائے، جس کی غرض وغایت خدمت خدا کے بجائے
خدمتِ مخلوق ہو۔!!!

حقیقت شاخ ہے وہم کی

جب حقیقت بحث و جستجو کی نو آفریدہ شاخ ہے، تو بحث بھی وہم کی نوزائیدہ کونپل ہے، ہم پہلے خیال کرتے ہیں، پھر بحث و جستجو اور آخر میں تحقیق کی باری آتی ہے، ہم کو عمارت بنانا ہے، تو پہلے گھر بنانے کا خواب دیکھتے ہیں، اپنے دماغ کے اندر ایک مضبوط تیار شدہ عمارت کا وہم و خیال کرتے ہیں، پھر اس کے اسباب و آلات کو تلاش کرتے ہیں اور آخر میں ہم اپنے پہلے ترتیب یافتہ خیالی خاکہ کے مطابق عمارت بناتے ہیں ——— جہاں کہیں کوئی انقلاب یا اصلاحی خیال کسی قوم کو پیش آتا ہے، تو وہاں سب سے

پہلے کسی فلسفی و مفکر کا وہم و خیال کار فرما ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا قضیہ کا عکس نہیں ہوتا، کیوں کہ فلسفیوں کے اکثر و بیشتر خیالات اور خواب ضایع ہو گئے، اس کے دو وجوہ ہو سکتے ہیں، یا تو وہ سب کے سب پریشانیوں کا طومار تھے، یا یہ کہ اُن کا ظہور اُن کے وقت سے پیشتر ہو گیا تھا، لیکن اگر ہم جدید تخیلات کا تجزیہ و تحلیل کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اُن کے اندر وہ نظریات و تخیلات کار فرما تھے، جن کو فلاسفہ اور مفکرین نے پیش کیا تھا۔

قارئین کی والہانہ نگاہیں، جو زیادہ تر حقایق کی طرف مائل ہیں، یہ گمان کرنے لگتی ہیں، کہ ان خوابوں کے اثرات، جن کو فلسفیوں نے دنیا کے رو برو پیش کیا ہے، ہماری اجتماعی تشکیل کے لئے کمزور ہیں، درحقیقت اُن کے اثرات بہت قوی بلکہ بعض اُن حالات میں جہاں ان اثرات کا پایا جانا ضروری تھا، بہت ہی موثر اور تیر بہدف ثابت ہوئے، مثلاً اگر روس کا اشتراکیت پرست طبقہ یا کونین اور کروپٹکین جیسے اصحاب کے اشتراکیت پرور خوابوں کی بخوبی تصدیق نہ کرتا، تو اُس کو اپنے عارضی اور غیر مکمل نظام کی اُن خرابیوں اور نقائص کا علم نہ ہوتا، جو اُس کی بنیادوں کو ڈھانے کے لئے کافی تھے ——

اس میں کچھ شک نہیں کہ قوموں کی عصبیت کا سبب اس کے سواد

اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ محض مسیحیت کے اس خواب کی تحقیق ہے، جو عالم میں امن و سلامتی کو ایجاد کرنے سے متعلق ہے۔ نطشے بھی ولایات متحدہ یورپ کا خواب دیکھ چکا ہے ——— ؛ ویلز نے اپنی خوش حالی میں ایک عالم گیر حکومت کا خواب دیکھا، جس کے آگے سارا عالم سرتسلیم و رضا خم کرتا ہے۔

چنانچہ امریکہ کا وہ انقلاب، جس کے نتیجہ میں ولایات متحدہ کی تاسیس معرض عمل میں آئی، یا وہ فرانسیسی انقلاب، جس نے آخر کار فرانس سے ملوکیت کا خاتمہ کر دیا، اگر ان دونوں انقلابات اور ان کے نتائج و عواقب کو بنظر عبرت دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ امریکہ اور فرانس میں ان دونوں کا ظہور فلاسفہ کے خوابوں کے بعد مساوات و حریت کے نشو و نما یافتہ جذبات و تحریکات کے ذریعہ ہوا، یہ تمام افکار وہ ہیں جن کی تحقیق کے لئے لوگ اب تک کوئی نہ کوئی سبیل پاتے رہے ہیں۔

تعلیم کو عام کرنے کا مسئلہ بھی اُس کے اندر پایا جاتا ہے، اکثر و بیشتر فلاسفہ نے اس کی دعوت دی ہے، جو اب تک مدارس کے عام ہونے کے برخلاف حقیقت سے بڑھ کر "خیال و خواب" ہو کر رہ گیا ہے۔

اب ہمیں یہاں اسی مسئلہ کے عمومی و خصوصی پہلوؤں پر غور و خوض

کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ خیال کا اثر نفس پر اور اس کا انقلاب عقل و شعور پر کس طرح ہوتا ہے، کیونکہ جن ارباب بحث و نظر نے سوسائٹی کی تشکیل کے بارے میں جہاں زوردار تخیل پیش کیا ہے، وہاں تعلیم اور اس کی عمومیت کے مسئلہ پہ بھی کافی روشنی ڈالی ہے، جس طرح سے کہ انھوں نے مساوات کے خوشگوار دور کی آرزو کی اور اس کے رو بہ عمل لانے پر اپنی مساعی جمیلہ کو صرف کیا، انھوں نے اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا، کہ علمی میدان میں مساوات کو اس کی ساری شاخوں سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں پیش کیا جائے ——— اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف بیسویں صدی گذرنے بھی نہ پائی تھی کہ تمام مغربی قوموں نے اپنے فرزندوں کے اذہان و نفوس میں عمومیت تعلیم کو واجب قرار دینے کا نظریہ راسخ کر دیا تھا؛

مگر ایک فلسفی کے تصور و خیال کو اس حقیقت حال کے ساتھ، جو متوسط طبقہ میں پائی جاتی ہے، موازنہ کر کے دیکھا جائے، تو یقیناً ایک نمایاں فرق نظر آئے گا، کیونکہ آج کل یورپ میں تعلیم اپنی اصلیت اور حقیقت سے نکل کر محض ظاہری اور سطحی شکل و صورت اختیار کر چکی ہے، درحقیقت وہ اس کھلونے سے بڑھ کر نہیں، جس کے

آلات قلم اور کاغذ ہوں، چنانچہ بچے کاغذوں پر جغرافیہ کا کچھ حصہ، تاریخ کا کچھ حصہ اور خرید و فروخت کا تھوڑا بہت حساب سیکھ جاتے ہیں، تصویریں ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ میں اُتار لی جاتی ہیں اور اشعار کتاب سے حفظ کر لئے جاتے ہیں، اکثر و بیشتر گھروں میں چند باہم ملے جلے اوراق پائے جاتے ہیں، جو کتابوں کے نام سے موسوم ہیں، ہم میں سے ہر شخص کا دعوٰے یہ ہے کہ ان کتابوں کے اندر مفید اور کارآمد معلومات ہیں اس تعلیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ کاغذوں کے انبار میں زیادتی ہو گئی، چنانچہ ہم ہر روز کاغذ کے بے شمار رسالے پڑھنے لگے، تصویریں کھینچ کر یا کسی کتاب سے نقل کر کے اُن کا معاوضہ لینے لگے، لیکن جن فلاسفہ نے عام مفید اور عملی تعلیم کا تخیل پیش کیا تھا، اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ چیز نہ گذری تھی کہ یہ کاغذی ثقافت ہی اُن کے خوابوں کی تعبیر ہو سکتی ہے، اُن کی شان یہ ہے کہ اگر اُن سے یہ سوال کیا جاتا کہ تصویر کشی کی تعلیم کس طرح دینی چاہیئے، تو وہ فوراً ہی جواب دیتے کہ کھیتوں میں، جنگلوں میں، بازاروں میں، بھیڑ بکری کے گلوں کے آس پاس، اور گھنے درختوں کے سامنے اس کی تعلیم دینی چاہیئے ـــــ، ولز سے اگر یہ مطالبہ کیا جاتا کہ جغرافیہ یا تاریخ کی کس طرح تعلیم ہو، تو وہ بلا تردد یہی جواب دیتا کہ "کیا یہ بھی پوچھنے کی چیز ہے، کیا دنیا میں نمونے

سیر و سیاحت کے اُس کا کوئی اور طریقہ ممکن ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ انسان اس دُنیا سے اس حالت میں وفات پائے، کہ وہ دریا، پہاڑ، اور ان جیسی چیزوں سے بے خبر اور نابلد ہو"؟

——— اگر کسی بڑے ماہر کیمیاء اور سائنس دان سے یہ استفسار کیا جاتا کہ ہم اپنے بچوں اور جوانوں کو کیمیاء کی تعلیم کس طریقے سے دیں تو اس کو یہ جواب دینے میں کچھ بھی تامل اور پس و پیش نہ ہوتا، کہ "یہ چیز کٹھالی اور اس قسم کے تقریباً بیس تیس دیگر آلات داو زار کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی"۔

لیکن وہ اربابِ سیاست، جو بلا استحقاق قوموں کی قسمت کے مالک بن بیٹھے ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم قوم کے نازک کندھوں پر گراں قدر اخراجات کا بوجھ ڈالتی ہے، اس لئے وہ تعلیم کی اصل شکل و صورت کو بگاڑ دینا چاہتے ہیں اور اس کو ان کھلونوں کی طرح بنا دینا چاہتے ہیں، جو قلم، کاغذ اور روشنائی سے بنائے گئے ہوں، وہ اِس اَمر میں سہولت سمجھتے ہیں کہ نوجوان اپنی کتاب میں پڑھ لے کہ سمندری جانور اِس قسم کا ہوتا ہے، اُس کے یہ اوصاف ہیں، اُس کی قسمیں لکھ دی جاتی ہیں، جیسا کہ حسابی پہاڑے لکھ دیئے جاتے ہیں، طالب علم اُن کو اپنے سطح قلب سے حفظ کر لیتا؛

کیوں کہ یہ چیز ایک سیاسی مقتدر پر اس بڑی جھملی ایجاد کرنے سے زیادہ آسان ہے، جو سالانہ تقریباً دس ہزار روپئے کا خرچ عائد کرتی ہو؛ ادھر طالب علم یا مصوّر کے لئے بھی یہ آسان ہے کہ وہ کاغذی پودوں کو اپنے صفحۂ ذہن پر نقش کرے اور اُن کی تصویر اپنے قلم سے کتاب کے ورق سے کاپی میں نقل کر دے، کیوں کہ وہ سیاسی مقتدر و رہنما جو بلا کسی حق کے قوموں کی سیاست کے فرائض انجام دے رہا ہے، اِس بات سے بخوبی واقف ہے کہ جنگل اور کھیت میں جا کر طالب علم کو پودوں کی زندگی اور اُن کی نشو و نما کے متعلق تعلیم دینا قوم پر غیر معمولی اخراجات کا بار ڈالنے کا مصداق ہے، اور اسے اِس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر وہ قوم سے اُن اخراجات کا مطالبہ کرے گا تو قوم اُس کو اِنتخاب سے گرا دے گی، اِسی وجہ سے وہ قلم اور کاغذ کے کھلونوں کو ترجیح دیتا ہے؛

ماہرینِ فنِ تعلیم اِس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ حقیقی تعلیم وہی ہے، جو اِنسانی طبیعت و فطرت کے مطابق ہو اور اس کے ذریعہ سے اِنسان اپنی زندگی کے حقیقی مقام پر پہونچے اور اپنی زندگی کو اُس پر منطبق کرے ——— ایک بچّے کے لئے بجائے یہ جتلانے کے کہ آگ جلاتی ہے، بہتر یہی ہے کہ آگ کا اِحساس کرانے کے لئے

اُس کی اُنگلی آگ میں جلائی جائے، کبھی دن کو ہساروں کے دامن میں اُس کو لے جانا، صحرا کی ہوا کھلانا، یہاں کی گرمی کا احساس کرانا اور یہاں کے دیہی مناظر سے روشناس کرانا، اِس بات سے کہیں لاکھ درجہ بہتر ہے کہ محض کتابوں کے ذریعہ اس کو حضارت و بداوت (شہریت اور گنوارپن) کا موازنہ اور دونوں کے محاسن و نقائص کو سمجھایا جائے، جنگلوں اور پہاڑوں کی ذہنی سرگذشت بیان کی جائے اور حیوانات و نباتات کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے۔

یہ کہنا انصاف سے بہت بعید ہے کہ آج کل تعلیم کا مشن محض قلم اور کاغذ کے ذریعہ چلتا ہے، حق بات تو یہ ہے کہ اگر یہی نظریہ تسلیم کر لیا جائے، تو طب اور ریاضی کا فن کبھی ترقی نہ کرتا، ایک عربی طبیب کو قلم اور کاغذ کے ذریعہ سے جو کچھ علم حاصل ہوتا، وہ اس کو امراض تک ہی محدود رکھتا تھا، اور خلفاء اطباء کو تشریح سے منع کرتے تھے، چنانچہ طب شعبدہ بازوں کے ہاتھوں میں ایک کم ترین کھلونا بن کر رہ گئی، قرونِ وسطیٰ کا علم بھی اسی نقشِ قدم کا سلسلہ تھا، جدید مغربی اِرتقائی دَور میں علماء و فلاسفہ قلمی و کاغذی علوم و فنون کو چھوڑ کر طبیعت و فطرت کی طرف مائل ہوئے، نباتات و حیوانات کی تشریح

کرنے اور اپنے ہاتھوں سے علمی و عملی تجربات و امتحانات کرنے لگے لیکن اس طریقہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیوں کہ آج کل ہماری ثقافت کا دارومدار زیادہ تر کاغذ ہی پر ہے اور وہ اسی لئے ہمارے اذہان و طبائع کے ساتھ پوری مطابقت نہیں رکھتی، بلکہ ہمارے دل و دماغ پر غیر نتیجہ خیز اثرات پیدا کرتی ہے، مثلاً اگر ہم نباتات کے اقسام بحیثیت ان کی زندگی و موت کے معلوم کریں تو ہماری یہ معرفت نتیجہ خیز ظاہر کرے گی اور دنیا کے اِس عجیب و غریب کارخانہ میں جہاں اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ ہم محض اُس کے بارے میں سن سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے، ہر شخص کچھ نہ کچھ جدت و اختراع پیدا کر سکتا اور موجد و مخترع کہلانے کا مستحق بن سکتا ہے!

تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اُس کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ان چیزوں کے متعلق کہ جن کے خواب فلاسفہ نے دیکھے ہیں، اِتنا کہہ سکتے ہیں کہ عوام نے محض اس کے چھلکے کو لیا اور مغز کو پھینک دیا، کیونکہ موجودہ ممالک اور ان کے نظام کا اکثر و بیشتر حصہ جو قابلِ نقل و حرکت مصنوعات و اختراعات کی فراوانی سے قائم ہے، اس کے اندر فلاسفہ کے اُن خوابوں کا رنگ جھلکتا ہے، جو عہد آلات کی خبر دیتے ہیں، فلاسفہ جب اختراع آلات کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں، تو اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہیں کہ لوگوں کے

وقت کے اکثر و بیشتر حصہ کو بچایا جائے، تاکہ وہ اِس بقیہ وقت کو اپنے نفوس کی اِصلاح اور راحت و آرام میں صرف کریں، مگر عام قوموں نے اِختراعِ آلات کو کارخانوں کے مالکوں کی دولت و ثروت کو زیادہ کرنیکا ذریعہ بنا ڈالا، اُنھوں نے اِس بات کو فراموش کر دیا کہ اُس میں مزدوروں کو اپنی معاش کے لئے کس قدر جد و جہد اور مشقت و محنت صرف کرنی پڑتی ہے!!!

خوابوں میں اِنقلاب

یہ ممکن ہے کہ بعض ماہرین نفسیات اس نوجوان دوشیزہ عورت کے خواب کی تعبیر بیان کردیں، جس نے اپنے خواب میں ایک خوب رو سرو قامت، شکیل شہزادے کو دیکھا ہو، جس نے اس کو جگا دیا ہے اس کے ہاتھ یا منہ کا بوسہ لینا چاہتا ہے، مگر اس کی صحیح تعبیر یہ دوشیزہ کی اُس عقل باطن ———— پر اتہام ہے، جو بوقت خواب اُن جسمانی شہوتوں کے دروازے کو کھول دیتی ہے، جس کو عقل ظاہر ———— نے بیداری و ہوش کے عالم میں بند کر رکھا تھا ————، خواب

خواہ وہ بیداری میں دیکھے جائیں یا حالت خواب میں بہرحال اِن شہوتوں
اور رغبتوں کی دلیل ہیں، جن کو مکمل بیداری ثابت نہیں کر سکتی۔

ایک مورخ کے لئے جو خود کو کسی قوم کی تاریخ کا درس دینے
کے لئے وقف کر چکا ہو، یہ امر زیادہ پائدار اور منفعت بخش ہے کہ وہ
اس قوم کے ان خرافات کی طرف توجہ کرے، جن میں اُس کے خواب
بکثرت پائے جاتے ہیں، پھر اُن کا مطالعہ کرے، اور ان سے اُن
نفسیات واِحساسات کا پتہ لگائے، جن سے اس قوم کے افراد کے
نفوس آشنا ہوتے تھے، مثلاً فراعنہ کی اس تاریخ کے مطالعہ سے، جس
میں جنگوں، قیدیوں، فتوحات اور ان کے مانند اور چیزوں کا تذکرہ
پایا جاتا ہے، اس قوم کی تاریخ کو معلوم کرنے میں اِتنا فائدہ حاصل نہیں
ہوتا، جتنا کہ کسی من گھڑت قصہ اور عجیب وغریب واقعہ کو، جس کو
عام طور پر لوگ اپنی داستانوں میں بیان کیا کرتے تھے، تجزیہ وتحلیل
کرکے حاصل کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس مافوق اور عجیب وغریب قصہ
میں عوام کے جذبات واِحساسات کی تصویر جھلکتی ہے، جس سے
اُن کے نفسیاتی خصوصیّات کا بآسانی پتہ لگایا جا سکتا ہے، یہ اُن کی
حالتوں، اور خصوصیتوں کو بیان کرنے میں فراعنہ کے ان من گھڑت
اور جھوٹے قصوں سے زیادہ صادق ہیں، جن کو وہ بسا اوقات اپنی طرف

سے موت کے پیشتر لکھا کرتے تھے :

ان من گھڑت خوش حالیوں میں سے، جن میں انسان نے غور وفکر کیا، پہلی خوش حالی وہ تھی جو دین کا ایک جزو بن گئی، قدیم مصری نے جب دیکھا کہ دنیا میں اپنے حال کی اصلاح ناممکن ہے اور اس پر استبدادی قوتوں کا وہ تسلط ہے، جو اس پر نت نئے مظالم ڈھاتا رہتا ہے، پھر یہ کہ وہ دن بھر دھوپ میں محنت ومشقت کرتا ہے، تو وہ اس جنت النعیم کا خواب دیکھنے لگا، جو موت کے بعد حاصل ہوتی ہے، وہ دنیا میں محنت ومشقت کرتا ہے، ظالم حکام اس پر ظلم وجور کرتے، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پامال کرتے ہیں، باوجود اس کے اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ آخرت میں میزان قائم ہوگا، جہاں ان ظالموں کو سزائے سخت دی جائے گی اور ان لوگوں کے لئے جنھوں نے دنیا میں مصائب وآلام برداشت کئے، ان درختوں کے سایہ میں راحت وآرام حاصل ہوگا، جن کے درمیان پانی کے چشمے ترنم ریزیاں کرتے ہوئے بہتے ہوں گے، چنانچہ یہ مصری اپنے اس خواب شیریں میں اس بھوکے یا پیاسے انسان کے مشابہ ہے، جو اپنے خواب میں آراستہ دسترخوانوں اور بہترین پاکیزہ شراب کے چھلکتے ہوئے پیالوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ اس مصری کا خواب قوم کا

مجموعی خواب بن گیا اور فرد سے جماعت کی طرف منتقل ہوتا گیا۔

پھر فلسفی کا ظہور ہوا، اُس نے اِس عالم کے لئے اپنی خوش حالی کا خاکہ کھینچا، جس کو موت کے بعد کی کچھ پروا نہ تھی، کیونکہ فلسفی اُن خواب دیکھنے والوں میں سے ہوتا ہے، جن کے خواب کی تعبیر اسی دنیا میں ظاہر ہوتی ہے، اس کا اعتقاد اور بھروسہ زیادہ تر محسوس حقایق و مشاہدات پر ہوتا ہے، وہ مبداء و غایت سے بڑھ کر مادہ اور ذریعہ پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے، اِس لئے جب ہم اکثر و بیشتر خواب میں تلاش و جستجو کرتے ہیں اور جب اُس کے خاتمہ پر پہونچتے ہیں تو یہ سوالات کرتے ہیں کہ کیا یہ وہی سعادت و ترقی ہے یا یہ وہی چیز ہے جو ان دونوں کے معاوضہ میں حاصل ہوئی ہے، ہم اصل کے مقابل ہیں یا بدل کے ——— ؟ پھر ہم یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ باوجود صدیاں گذرنے کے کیا وجہ ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر ظاہر نہ ہو سکی ؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم فلسفیوں اور اُن کے علاوہ دیگر مفکرین کے خوابوں کے مقابل ادیان و مذاہب کے حیات آفریں حقایق میں تمیز کر سکتے ہیں، کیونکہ مذہب پیشتر اِس کے کہ دوسرے عالم کی خوش حالی کو پیش کرے فرد سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے دل کی تاریکیوں کو ایمان کی تجلیوں سے روشن کر دے اور نفس کے گرد و غبار

کو حق و صداقت کے جوہر سے پاک صاف کر کے ایک مومن خوش حال کے نفس میں تبدیل کر دے، جس کی رگ و پے میں ایمانی حرارت دوڑتی رہے، پھر اپنے اس ظلمت پرور نفس کی اصلاح کرے، جو شکوک و شبہات پیدا کر کے دل کی فضاؤں کو مکدر کر دیتا ہے، جب اس قدر ایمان کی تجلی کسی فرد کے دل میں فروزاں ہو جائے، تو ایک مومن فرد میں اقتصادی معاشرتی، اجتماعی زندگی کی اصلاح کرنے اور نظام حکومت، شادی بیاہ کے امور انجام دینے کی صلاحیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کے لئے تمام اسباب و وسائل فراہم کر لیتا ہے، بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب فرد کے دل میں تغیر پیدا کرنے کے بعد جماعت کی تشکیل و تعمیر کا قصد کرتا ہے، اسی مقصد کے مدنظر وہ افراد کی اصلاح کرتا ہے، بلکہ اس کو نئی زندگی بخش کر جماعت کا صالح رکن بننے کے لئے تیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ محض فرد ہی ہے، جب وہ خود اپنے حال کی اصلاح نہ کر سکے، تو اس سے اس امر کا مطالبہ کس طرح کیا جا سکتا ہے، کہ وہ سوسائٹی کی حالت میں کوئی انقلاب پیدا کر دے!

یہی فرق ہے ادیان کے حقائق اور فلاسفہ کے خوابوں کے درمیان مذاہب نے سوسائٹی کی اصلاح کا دار و مدار افراد کی اصلاح پر رکھا ہے،

اسی نظریہ اور اصول کے تحت کوئی مسلم، مسیحی یا یہودی سوسائٹی تشکیل پذیر ہو سکتی ہے، لیکن فلاسفہ کی خوش حالیوں نے خصوصاً انیسویں صدی میں افراد کی ذرا بھر پروانہ کی، اُن کی تمام تر توجہات کا مرکز سوسائٹی بنی رہی

اُنیسویں صدی میں بے شمار اِصلاحی تحریکات بلند ہو رہی ہیں، جن میں زیادہ تر بلند آہنگی کے ساتھ اقتصادی اصلاح کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے اندر بھی وہی تخیلات کار فرما ہیں، جو حکومت، تربیت یا اس کے مانند اس سوسائٹی اور ماحول کے معاملات کی اِصلاح کی طرف دعوت دیتے ہیں، جس میں اِنسان زندگی بسر کرتا ہے، یہ تمام کے تمام ان دو اساسی شرطوں سے خالی نظر آتے ہیں، جو کسی اِصلاحی دعوت کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں،

پہلی شرط:- فلسفیوں کی تحریکات کی غرض وغایت پورے طور پر واضح نہیں تھی ایا صحت وجمال ہے یا مال کی فراوانی یا حسنِ ادارت ان میں سے کونسی چیز اُن کا مطمح نظر ہے، کیا یہ تمام یا بعض چیزیں فلاسفہ کے خوابوں کا مقصد ومدعا ہیں؟ کیا یہ سعادت اور ترقی تک پہونچا سکتی ہیں؟

دوسری شرط:- افراد کی اِصلاح کے لئے کوئی وسیلہ فراہم نہیں کیا گیا، یہ امتیاز صرف مذہب کے لئے مخصوص ہے کہ اُس نے لوگوں کے

دِلوں میں تغیر و اِنقلاب رُونما کیا اور اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی اِصلاح کی، بخلاف اس کے خوش حالی کا خواب دیکھنے والوں نے افراد کے دلوں میں کوئی اِنقلابی اَثر پیدا نہیں کیا، جو اُن کے افکار و خیالات کے قبول کرنے کا پیش خیمہ ہوتا؛

ہر قوم میں اکثریت محض عوام کی نہیں ہوتی، بلکہ ان کے اندر بہت سے اَوباش بھی ہوتے ہیں، جو زیادہ تر فوق البشر کی بہ نسبت فرد کی طرف مائل ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک دھواں دھار تقریر کرنے والا یا کوئی مکار باغی یا کوئی بے وقوف فرمانروا آسانی کے ساتھ اُن کو قابو میں کر سکتا ہے کیونکہ یہ تمام اشخاص عوام و اَوباش کے اُن جذبات و عواطف سے خطاب کرتے ہیں، جو اُن کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے بہت جلد آمادہ و مستعد ہو جاتے ہیں، لیکن ایک ایسے فلسفی کو، جو اُن کے عقول و اذہان سے خطاب کرتا ہے، اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ملتا، جو اُس کی دعوت پر لبیک کہے، جذبات و میلانات ہماری طبائع میں عقل کے مقابل زیادہ گہرے اور بیش بیش ہیں، جب وہ اپنی سرحد سے باہر قدم دھرتے ہیں تو عقل کے خلاف بھی بغاوت کا علم لہراتے ہیں؛

اِس لئے ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیوی خوش حالیوں کے علمبرداروں کو اپنے مقاصد میں اُس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ

وہ افراد کے دلوں میں کوئی انقلابی حرکت نہ رونما کردیں، یہ کوئی بڑی چیز نہیں، جیسا کہ پڑھنے والا سمجھتا ہے، دین کے اندر اتنی قوت ہے کہ افراد کے دلوں کو بدل دے، جب دین میں یہ تاثیر ہے تو یوجینل کس لئے انکی عقلوں سے ابلہی کو روک کر اور تولید و تناسل کی بڑھتی ہوئی رفتار کو تھام کر تغیر نہیں پیدا کر دیتی تاکہ انسان نسلاً بعد نسلٍ ارتقائی مراحل طے کرتا رہے اور انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی بھی ترقی کرتی رہے، کیونکہ مثلاً اشتراکیت انیسویں صدی کے فلسفیوں کے خوابوں کی ایک کرداری اور خصوصی تصویر ہے، اس میں اس درجہ فساد و انحطاط اس لئے رونما ہوا کہ اس کے کل پرزے اپنی نشست پر ٹھیک نہیں تھے۔

ہمارے اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ خوش حالیوں میں تین انقلابات و تغیرات رونما ہوئے ہیں:

(۱) عوام کی خوش حالی، جس کو ہم انکے قدیم و جدید قصوں میں پاتے ہیں، اُن حقائق حیات کی تکمیل کرتی ہے، جن میں نقص واقع ہو گیا ہے۔

(۲) مذاہب کی خوش حالی، یہ درحقیقت دو خوش حالیاں ہیں، ایک دوسرے عالم سے متعلق ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایمان دار کے دل کو آئندہ کی خوش حالی کے تصور اور اس کے وعدۂ مکافات سے تغیر پیدا کر دیتا ہے، جب افراد کے دلوں میں جلا پیدا ہو گئی اور تہذیب و شائستگی

کی کرن روشن ہوگئی اور دولتِ ایمان سے اُن کے دامن مالا مال ہوگئے تو وہ اُس ارضی خوش حالی کے مخالف نہ ہوں گے، جس کو مذہب ان کے لئے دنیا میں زندگی کے نظام کے لئے منور کرتا ہے۔

(۳) فلاسفہ کی خوش حالی، یہ اُس وقت تک معرض وجود وعمل میں نہیں آسکتی، جب تک کہ اس کی غرض وغایت ایک نہ ہو، اور وہ سعادت وترقی یا وہ خوشگوار زندگی ہے، جو افراد کے عیش وآرام اور جماعتوں اور خاندانوں کی ترقی کے اسباب ووسائل فراہم کرتی ہے، یہ اُسی وقت پائی جاسکتی ہے، جب کہ قوموں سے جہالت وبلاہت کو دور کیا جائے اور نسلی پیداوار کے بڑھتے ہوئے سلسلہ کو روکا جائے۔

نقد و نظر

ارسطو طالیس کے دورِ ظہور تک اِنسان کے معلومات اور اُس کے علوم و معارف ایک تھے، جن کا تمام تر سرچشمہ اَدب تھا؛ اَدب اور سائینس کے مابین کوئی حدِ فاصل نہ تھی، کیونکہ اَدیب، جو بذاتِ خود خیالی شخص ہے، سائینس دان بھی تھا، اور سائینس دان جو بذاتِ خود حقیقت پسند ہے، خیالی اَدیب تھا، جب اَرسطو طالیس کا دور آیا اور اُس نے "تاریخ طبیعی" لکھنا شروع کی، تو اُس کے دل میں ایک علمی رجحان پیدا ہوا، جس کی اساس و بنیاد تجربہ و مشاہدہ

پر قائم تھی، اس کے ذریعہ اُس نے ادب اور سائنس میں امتیازی حدود مقرر کر دیئے، اس کے بعد مدرسۂ اسکندریہ کا ظہور ہوا، جس میں علم وحکمت کی قدر و منزلت اور اس پر توجہ و اعتناء ادب کی بہ نسبت بیشتر تھی، اس کے بعد عربوں کا زرین دور آیا، اُن کے ادب میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو اُن کے نفس کو خیال و خواب کی فضاؤں میں جانے پر برانگیختہ کرتی، کیوں کہ عربی ادب کی اساس سنجیدہ الفاظ پر ہے، اور نفس کے اندر طرب و سرور پیدا کرنے کے لئے الفاظ کی نغمہ ریزی اور ان کی لطافت آفرینی کافی تھی، اس لئے عربوں کی ایک بڑی جماعت تجرباتی اور مشاہداتی علم کی طرف راغب ہو گئی، جب یورپ کے ارتقاء جدید یا نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوا، تو اہل یورپ عربوں کے بتلائے ہوئے راستہ سے قدیم یونانیوں تک پہونچے، ایک طرف اُنھوں نے عربوں سے علمی و حکمی رجحانات اخذ کئے تو دوسری طرف یونانیوں سے ادبی و فنی معلومات و نظریات کسب کئے۔

ادب اور سائنس کے درمیان امتیاز اور فرق کو بیان کرنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی حاجت ہے، چنانچہ سائنس موضوعی ہے اور ادب ذاتی، سائنس داں جب کسی دھات کے ٹکڑے سے یا کسی مرض سے، یا کسی ستارے سے، یا کسی نبات سے بحث کرتا ہے

تو وہ نفسِ شئی سے کوسوں دور رہتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس شئے کا اس کی ذات سے کیا علاقہ ہے، نیز وہ اپنی اِس بحث میں اُس کی پروا نہیں کرتا کہ اُس سے اِنسان کو فائدہ پہونچتا ہے یا نقصان، کبھی سائنس داں اپنی تلاش وجستجو کے دَوران میں کسی سخت اور تیز زہر کو پالیتا ہے، اُس کی بحث میں یہ چیز داخل نہ ہوگی کہ ممکن ہے کہ اِس زہر کو جنگ میں دشمن کی ہلاکت کے لئے اِستعمال کیا جائے اور ممکن ہے کہ اِس کے ذریعہ تمام نوعِ اِنسانی کو ہلاک کرنے کے لئے کوئی دوسرے زہر کا اِنکشاف ہوجائے، کبھی دَورانِ تحقیقات میں وہ کوئی آلہ اِختراع کرلیتا ہے، اَب اُسے مزدوروں اور کاریگروں کی پروا نہیں، جن سے وہ اِس آلہ کو اِستعمال کرکے بے نیاز ہوجاتا ہے، کیوں کہ وہ اُس سائنس کے تعلق کو، جس میں وہ بحث کر رہا ہے، اِنسان کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا، بلکہ اُس کی تمام تر توجہ نفسِ سائنس پر ہے، وہ اُس میں بحث وتحقیق کرتا ہے، درآں حالیکہ وہ اس سے ناواقف ہے اور اُس کی منفعت یا اس کے ضرر سے دور ہے، جب تم کسی سائنس داں کو اپنے ذہن کی زیادتی یا عمل وصنعت گری میں آلات کی فراوانی کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھو، تو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ وہ اُنہی چیزوں میں مشغول رہے گا، اُس کو اُس سے قطعاً بحث نہ ہوگی

کہ اِس آلہ کے سامنے کھڑے ہوئے کام کرنے والے میں اُن چیزوں کی تاثیر کیا ہو گی؟

اور اس کے درمیان اور مالک آلہ کے درمیان کس قسم کے نئے تعلقات اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں؟

اِن تمام مذکورۂ بالا صورتوں میں ادیب کا حال جُداگانہ ہے، کیونکہ اُس کے فکر و نظر کا موضوع اِنسان ہے، چیزیں نہیں، وہ اَدب کی مشق و مزاولت محض اپنی ذات کے لئے نہیں کرتا جیسا کہ ایک سائنس داں کا مطمح نظر ہے، بلکہ وہ اپنے اَدب کو اِس لئے رائج کرتا ہے اور اُس کی مشق کرتا ہے کیونکہ اس کا تعلق انسان سے ہے، اِسی لئے وہ خیالی ہے، اِسی وجہ سے وہ ہمیں دین، اَخلاق اور شرائع میں بحث کرتا ہوا دکھائی دے گا، لہٰذا ادب باعتبار اپنی طبیعت و مزاج کے اِصلاحی ہے جس کا موضوع اِنسان ہے، سائنس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اِصلاحی ہو یا اِفسادی، کیوں کہ اس کا موضوع محض اشیاء ہے، اَدیب اپنے ذہن اور فکر کے گوشوں میں تمام علوم و معارف کی جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہے، تاکہ اُن کے ذریعہ یہ معلوم کرے کہ اُن میں سے کونسے معلومات اِنسان کے لئے مفید ہیں، جنھیں وہ اِختیار کرے اور اُن میں مشق رانی کرے، لیکن جو اِس قسم کے نہیں ہیں اُن میں فکر و غور کرنا چھوڑ دے، یہی حال

ایک سائنس دان کا ہے، کہ وہ کسی انسانی چیز میں بحث کرتا ہے تو اُس کو از روئے "شی" نظر کرتا ہے، جو انسان سے مستقل ہے؛

سقراط کا یہ قول ادیب کی روح کو اُجاگر کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"تو جانتا ہے کہ کھیت کے درخت مجھے کچھ
بھی تعلیم نہیں دیتے، بلکہ میں بازار میں
انسانوں سے مستفید ہوتا اور معلومات
اصل کرتا ہوں"

لیکن اس کے بعد ارسطو طالیس کا ظہور ہوا تو اس نے علوم و معارف کی دو قسمیں کر دیں، ایک خارجی معلومات جن کو تمام لوگ حاصل کر سکتے ہیں، یہ معلومات ادب اور اس کی تمام شاخوں پر مشتمل ہیں، اس کی اساس و بنیاد انسانی تجربے اور مشاہدے ہیں، دوسری داخلی معلومات، ان کا موضوع اشیاء کائنات ہے اور سائنس نام ہے اُن کے مطالعہ اور درس کا، پہلی قسم عوام کے علوم سے اور دوسری قسم خواص کے معارف سے متعلق ہے؛

اب ہم اسی تقسیم پر چلتے ہیں، عوام کا ہر فرد حق دار ہے کہ وہ

دین، یا اَخلاق، یا شاعری یا داستان گوئی، یا عمران یا اقتصادی اُمور کے متعلق گفتگو کرے یا اُن میں کچھ خامہ فرسائی کرے، لیکن اُس کو کیمیاء یا طب یا ہندسہ کے متعلق لکھنے کا کوئی حق نہیں؛

ہم نے اُوپر بیان کیا ہے کہ یورپ کے اِرتقاءِ جدید میں علمی رجحانات پائے جاتے ہیں، اَب تک ان کا وہی حال ہے، اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہر زمانے میں بڑے بڑے سائنس داں اپنے عہد کے سربرآوردہ اَدیبوں میں بھی شمار ہوتے تھے، کیوں کہ ایک بڑا ذہن اِس بات پر کبھی رضامند نہیں ہوتا، کہ وہ محض ایک مخزن کی حیثیت سے رہے، جس میں علوم و معارف کا ذخیرہ ہو اور اس سے کوئی غرض و غایت وابستہ نہ ہو، جب تم سائنس میں غرض و غایت کا لفظ لاؤ گے، تو سائنس کو اَدب کے قالب میں ڈھال دو گے؛ کیونکہ تم اس وقت صرف اسی قول پر اِکتفاء نہ کرو گے کہ الماس ایک قسم کا کاربن ہے، بلکہ تم یہ سوالات کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ کیا وہ خوبصورت ہے! کیا وہ ایک گراں قدر خرچ سے حاصل کرنے کے سزاوار ہے، کیا یہ عمرانی مصلحت میں سے ہوگا کہ اس کو انسانوں کا ایک طبقہ پہنے اور دوسرا طبقہ نہ پہنے، پھر ان دونوں میں سے بنی نوع اِنسان کے لئے کون زیادہ نفع بخش اور زیادہ باعثِ حسن و جمال ہے

کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، چہرہ کی خوبصورتی یا جمالِ صنعت، یعنی یہ کہ انگلیاں بذاتِ خود خوبصورت ہوں یا الماس کی وجہ سے خوبصورت بنائے گئے ہوں؟

یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ادیب سائنس داں تھے اور بڑے بڑے سائنس داں ادیب، یہاں ارسطو طالیس کا نام بطور شہادت پیش کرنا کافی ہے، ایک طرف وہ بلاغت کے اصول تالیف کیا کرتا تھا تو دوسری طرف طبیعی تاریخ تصنیف کرتا تھا؛ اسی طرح دافنشے ہے، جو مصوری کی مشق بھی کرتا تھا اور طیارے بھی ایجاد کرتا تھا، یہی حال گوئٹے کا بھی ہے، جو فن تشریح کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور شعر گوئی میں مصروف نظر آتا تھا، لیکن آج کل اکثر و بیشتر سائنس دانوں کے طبقہ نے ایک خاص شکل و صورت اختیار کر لی ہے اور ادیبوں کے طبقہ سے بہت دور ہو گیا ہے، دونوں کے مابین یہ بُعد اور ایک دوسرے سے جدائی نے اس اجتماعی ہیئت میں بڑے نمایاں اثرات چھوڑے ہیں، جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں؛

دوسری وجہ یہ ہے کہ ادب اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اُس وقت تک زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتا، تاوقتیکہ وہ علم و حکمت کی اساس پر قائم نہ ہو، فلسفہ و حکمت بذاتِ خود ایک وسیع وادی ہے، جس کا نہ کنارہ ہے

اور نہ حد، بشرطیکہ ادیب اُس کے وسیع گوشوں کو اپنے کرۂ دماغ میں سمولے اور اُس کے نقوش کو صفحۂ ذہن پر ثبت کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور حکمت ہر دو زندگی کے سرچشمہ سے دور جا پڑے، آج کل کا ادیب، خواہ وہ دینی شخص ہو یا مصور، ناول نگار ہو یا شاعر یا ادب کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والا، مثلاً گھریلو خوش حالی سے بحث کرتا ہے، حالانکہ وہ اس سے ناواقف ہے کہ عمارت کے بنیادی ساز و سامان کیا ہونا چاہیئے؟ گھر میں کس قسم کے پودے لگائے جائیں جو خوشحالی اور زیب و زینت میں اضافہ کردیں، حفظانِ صحت کے اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے یا نہیں، شہر میں صفائی کے کیا اصول ہیں، غرض کہ ان تمام بنیادی چیزوں سے، جن سے ایک سائنس داں خصوصی طور پر واقف ہوتا ہے، ادیب نابلد ہے، لیکن سائنس دان بھی اسی مرض میں گرفتار رہے، حالانکہ وہ ان چیزوں کو تو جانتا ہے مگر گھر کے حسن و جمال کو بڑھانے والے اجزاء و عناصر سے ناواقف رہتا ہے، اِس اصول کو چھوڑ کر وہ اس طرح عمارت بناتا ہے گویا کوئی قید خانہ یا کارخانہ تعمیر کر رہا ہے!

ہمارے گذشتہ بیان کا سارا خلاصہ یہ ہے کہ فلسفیوں کے خوابوں میں مجموعی طور سے بہت بڑا نقص اور عیب پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ تمام خواب نتیجہ تھے ادیبوں کے افکار کا، یا پیداوار تھے سائنس دانوں کے

افکار و نظریات کی، بہت کم ادیب ایسے ہیں جو افلاطون یا ولز یا ہیڈسن کی طرح فلسفی نظر آئیں، جنھوں نے اپنی خوشحالی کے تخیل میں ادب و فلسفہ وحکمت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہو، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں انسان کے لئے یہ دشوار ہے کہ ادب و فلسفہ کو ہم آہنگ کردے تاوقیتکہ وہ سطحی طور پر علم وحکمت کے جملہ شعبوں پر قناعت نہ کرے، اس کا سبب یہ ہے کہ علم وحکمت نے بہت ترقی کرلی ہے؛ اس کے کسی ایک شعبہ کا احاطہ کرنے کے لئے پوری زندگی بھی ناکافی ہے؛ یا تو اس کے لئے دوسو یا تین سو سال کی عمر ہو یا یہ کہ ہم اپنی اس قلیل عمر میں بہت تھوڑے مطالعہ پر اکتفاء کرلیں۔

لیکن ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ علم وحکمت کے شعبوں کا ارتقاء ایسا ہو کہ اس کے ساتھ ساتھ ادبی شاخوں میں ترقی نہ ہو، تو یہ لوگوں کے لئے بے حد ضرر رساں ہوگا اور اس ارتقاء میں کوئی فائدہ نہ ہوگا، مثلاً اگر انسان علم کیمیاء سے روشناس ہو جائے نیز اُسے اُن زہریلی گیسوں کا بھی علم ہو جائے جو وقتِ واحد میں فوجوں اور شہروں کو تباہ و برباد کردیتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ اُس کو انسان کے مستقبل کے متعلق کوئی ترقی پذیر خیال یا جمالیاتی نقطۂ نظر سے کوئی مہذب بلند عقیدہ نہ ہو؛ تو یہ علم کیمیاء ایک قسم کی نفسی اذیت ہے، جس سے اُس کو پرہیز کرنا

ضروری ہے۔

ہمارا موجودہ تمدن اور ثقافتِ حاضرہ سراپا سائنس کا مرہونِ منت ہے، جس میں سائنس اور کیمیا کے ہلاکت آفریں عناصر کارفرما ہیں، اور جوہرِ ادب سے عاری ہیں، یعنی یہ تمدن صناعتی تمدن ہے، جو غیر محدود طور پر آلی اختراعات و ایجادات کے نشہ میں چور ہے، لیکن جب صنعتیں اِرتقاء ہی سے حاصل ہوتی ہیں تو یہ زندگی کے اسباب و وسائل کی ایک صورت ہیں، اِسی لئے ہم موجودہ صنعتی اِرتقاء کے دَور میں ہمیشہ یہ سوال کرتے رہتے ہیں، کہ زندگی اور سعادت، اِرتقاء و جمال پر نظر کرتے ہوئے ہم میں سے زیادہ راستی پر کون ہیں، ہم یا قدماء مصر یا قدماء یونان؟

قبل اِس کے کہ ہم کوئی ایسا صحیح خیال سوچنا شروع کریں، جس کا عالمِ واقعہ میں پورا ہونا ممکن ہو، ہر چیز سے قبل مناسب اور ضروری ہے کہ ہم فلسفہ و اَدب کی اُن گھاٹیوں کو عبور کرلیں، جو باہم دیگر جُدا ہوگئی ہیں، اِس حالت میں فلسفہ و حکمت یا سائنس کو پیچھے چھوڑ دینا "عبورِ مرحلہ" میں شمار نہ ہوگا، اسی طرح محض اس کو ترقی دینے میں بھی کوئی فائدہ نہیں، ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ تنہا سائنس نے ترقی اِسی لئے کی کہ وہ زندگی کے تصور سے جُداگانہ چیز ہوگئی، یا صحیح لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کا اِرتقاء محض اِس لئے ہوا کہ جب وہ

شخصی عامل و موثر سے جدا ہو گئی اور اُس کا موضوع اِنسانوں سے قطع نظر اشیاء کائنات قرار پایا، تو یہ اُن تمام قیود و شرائط سے آزاد ہو گئی، جنھیں حکومت یا مال یا دین کے اَرباب اِقتدار فنونِ اَدب پر عائد کیا کرتے ہیں، جیسا کہ یہ واقعہ آج کل دینی یا عمرانی بحث کے لئے اُن کے معاملات میں پیش آرہا ہے، لہٰذا اَدب بھی اس وقت تک بامِ ارتقاء پر گامزن نہیں ہوسکتا تا وقتیکہ وہ بھی اَن پابندیوں اور سلاسل سے آزاد نہ ہوجائے اس طرح پر کہ عمرانی و تمدنی تجربہ اِس طرح انجام دیا جاسکے جیسا کہ کیمیاوی تجربہ انجام دیا جاتا ہے، دینی عقیدہ میں ندرت اور جدت بھی اسی طرح روا ہو، جیسا کہ کسی صناعتی آلہ کی اختراع کے لئے روا ہے، جب ایک اَدیب اپنا خیالی خاکہ تیار کرتا ہے اور اپنی خوشحالی کے تصور کو آئینہٴ دماغ میں مرتسم کرلیتا ہے، تو یہ محض لذت یابی یا تسلی خاطر کے لئے نہ ہو، بلکہ اس کی بنیاد و اساس علمی و حکمی قواعد وارکان پر قائم ہو، کہ اس کا یہ خیالی خاکہ علمی جامہ پہن لے اور جس کا جاری کرنا شہر، یا گاؤں، یا صوبہ یا کسی خطہ میں آسان ہو؛

اُنیسویں صدی عیسوی میں جس قدر خوشحالیوں کے خاکے تیار کئے گئے، اُن میں زیادہ تر توم کے لئے اِقتصادی نظام کے اسباب ولوازمات پر توجہ صرف کی گئی، ایسا ہونا ایک فطری اور طبعی امر تھا، کیونکہ گذشتہ صدی

میں آلات و ایجادات کے بکثرت رواج پذیر ہو جانے کی وجہ سے عظیم الشان اقتصادی انقلاب رُونما ہو گیا تھا، لیکن اقتصادی نظام تو ہر مرض کی دوا نہیں ہے۔

اس کا عقدہ بھی اس وقت تک حل پذیر نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر اہم مسائل کی بھی پیچیدہ گتھیاں نہ سلجھا دی جائیں کیونکہ زندگی کے مسائل کا مزدوروں، کاریگروں اور آلات کی تنظیم پر اعتماد کرتے ہوئے حل کرنا ایک علمی موضوعی ناقص حل ہوگا، کیوں کہ زندگی اَدبی حل کی بھی محتاج ہے، جس میں دینی، ثقافتی اور اَخلاقی زاویۂ نگاہ کا بھی اعتبار کیا جائے، یہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اَدیب فلسفی و سائنس داں نہ ہو، یا فلسفی و سائنس داں اَدیب نہ ہو جائے۔

دوسری عبارت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوم، جس میں سال میں ایک مرتبہ موٹر کار کی طرح کسی سواری میں ایک نئے آلہ کی ایجاد کے ساتھ ترقی ہوتی ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ وہ صحیح تمدن کی سڑک پر چل رہی ہے، تا وقتیکہ اُس کے دین میں ترقی نہ ہو اور سال میں کم از کم ایک مرتبہ وہ اپنے دین کا بھی جائزہ لے اور اسی کی تنقیح کرے۔ تمدن، جس سے ہم سائنس کے ایجادات اور اکتشافات مراد لیتے ہیں، صحیح تمدن نہیں کہلایا جا سکتا، تا وقتیکہ اَدبی

انکشافات اور جدت طرازیوں کی طرف ہم توجہ نہ کریں، وہ قوم جو جدید کیمیاوی تجربات انجام دے رہی ہے، اس کی زندگی جادۂ راست پر برقرار نہیں رہ سکتی تاوقتیکہ وہ افراد کے درمیان معاش کے جدید طریقوں کو رائج کرنے کے تجربات نہ کرے تاکہ عمرانی وتمدنی ترقی صناعتی وآلاتی ترقی کے دوش بدوش ہو جائے۔

مصر کے خوشگوار دور کی تمہید

دُنیا کی تمام خوش حالیوں کے خاکوں میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر خوش حالی فطری وطبعی طور پر مقامی ہے، ناممکن اور محال ہے کہ کوئی عالمگیر اور ہر جہتی خوش حالی ترکیب پذیر ہو جائے کیونکہ ہر مقام اور خطہ کا ایک شخصی جغرافیہ اور مخصوص ماحول ہوا کرتا ہے، یہاں کشاکش حیات کی جو گرم بازاری ہے، اس کو قایم رکھنے کے لئے مختلف طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے جو دوسرے کسی خطہ کے مقابل گوناگوں ہیں، زندگی کا مثالی اعلیٰ خاکہ جو مصر میں پایا جاتا ہے، لازمی ہے

کہ وہ جاپان یا برازیل کی طرزِ زندگی سے مختلف و جداگانہ ہو؛

خوش حالی کے تصور کے لئے جملہ شروط و قواعد کا ہم نے تذکرہ کر دیا ہے جن پر عمل درآمد کرنے سے خوش گوار نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن میں سے بعض وہ ہیں جن کو ایک ادیب سائنس داں اور فلسفی انجام دیتا ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں، جن کی حقیقت تک جمہور پہونچ سکتے ہیں، لیکن ان سب سے بیشتر یہ ضروری ہے کہ صاحب خیال یا خواب بین اپنے موضوع کو پسند کرے، اس کا موضوع سوائے اس کے وطن کے اور کیا ہو سکتا ہے؛

کیا ایک مصری ادیب کی وطنیت اور اس کی اپنی حب الوطنی کے متعلق مجھے کچھ شک و شبہ ہو سکتا ہے؛

پڑھنے والوں کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ "وطنیت" کا لفظ عربی نہیں ہے اس کی مثال "عائلہ" (خاندان) کی طرح ہے، یہ دونوں فرنگی معنی کا ترجمہ ہیں، ہمارے لئے یہ جاننا بس ہے کہ ہمارا ادب مصری ادب نہیں، بلکہ وہ عربی ادب ہے، جس کے سربرآوردہ متنبی، ابن رومی اور معرّی ہیں، ہمارے لئے یہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ مصریوں کے دل میں جزیرۂ عرب کو عزت و احترام کا ایک خاص مقام حاصل ہے، نیز یہ کہ حضرت موسیٰ باعزت نبی تھے اور فرعون ظالم و بدکار تھا،

پھر میں تمہارے سامنے یہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جس قدر مذہبی خوش حالیاں ہیں وہ ہر قسم کی دیگر دینوی خوش حالیوں پر غالب ہیں۔

یہ تمام وہ دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جو ہمیں اِس امر سے باز رکھتی ہیں کہ ہم مصر سے ایسا عشق رکھیں کہ ہمارے دلوں میں وطنیت کا جذبہ بیدار ہو جائے، جب سے کہ بداوت نے جزیرۂ عرب سے نکل کر مصریؔ رومی اور یونانی تمدن و ثقافت کے خلاف بغاوت پھیلائی تو مصری وطنیت عالمِ اسلامی میں شائع اور رائج ہوئی اور اس کا تمدن اور اسکی تہذیب عربی بداوت سے لبریز ہو گئی۔ اَب ہمارے لئے کوئی آثار ایسے نہیں جن کا ہم احترام کریں اور نہ ہم میں کوئی ایسے بطل پیدا ہوئے جن کو ہم یاد بھی کریں، ہاں قدیم زمانے میں یہ پائے جاتے تھے۔

پھر یورپ سے ایک آندھی اُٹھی جس سے ہم قومیت اور وطنیت سے روشناس ہوئے یا ہم نے اِن دونوں کو جاننا شروع کیا، اَب ہم اِس نوبت پر پہونچ گئے ہیں کہ فراعنہ کا تذکرہ نہایت شان و جلالت کے انداز میں کرتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ہم اُن پر لعنت بھیجا کرتے تھے؛

اَب ہم یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہم مصری ہیں، لیکن یہ شعور منجھتے منجھتے عقل ظاہر سے عقل باطن (تحت الشعور) کی طرف اُتر جائے گا۔

جب ہم مصر سے محبت کرنے لگ جائیں اور ہم جاحظ اور جرجانی کی تعظیم وتکریم کرنے کے بجائے مصر کے شاعروں اور انشاء پردازوں کی شان و منزلت بڑھانے لگیں، جب کسان ہمارے احترام کا موضوع اور ہماری اصلاح کا بطل بن جائے۔ جب ہم عہد فراعنہ کے فن تعمیر کے اسالیب کی نقل کرنے اور انہی کے طرز کے محل تعمیر کرنے لگ جائیں تو اس وقت ہم کو مصر سے محبت کا دعوی کرنے کا حق حاصل ہوگا، اسکی اس محبت کی وجہ سے ہمیں روا ہوگا کہ حسین وجمیل تخیلات پیش کریں جب تم کسی ادیب کو دیکھو گے کہ مصر کے کسان کی طرف کوئی توجہ نہیں دھرتا تو اس کے معنی سوا اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کو کسان سے محبت نہیں، جب وہ اس کو نہیں چاہتا تو مصر سے بھی اُس کو نفرت ہے، کیونکہ ہم تمام کسان ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادبار مصر کی بہ نسبت ہمارے ادیب تو عرب ادیب دولت عباسیہ کے ادیب ہیں، مصر کے موجودہ ادیبوں کی حالت یہ ہے کہ وہ کوئی مصری خوش حالی کے تخیل سے کوسوں دور ہیں، اُن کی اس حالت سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دل میں مصر کی ذرہ بھر محبت نہیں ہے، جس شخص کے دل میں کسی چیز کی محبت سما جاتی ہے تو وہ اس کا اکثر تذکرہ کیا کرتا ہے، جب ہم مصر کا ذکر کرتے ہیں، تو اُس کے حالات سے

ہمارے قلم شرمسار ہو جاتے ہیں۔ اُس کی بعض چیزوں سے محبت اور بعض سے نفرت کی وجہ سے ہم اُن کو نقد و نظر کی کسوٹی پہ پرکھنے سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اس وقت تو بس ہمارا یہ کام ہونا چاہیئے کہ ہم مصر کے لئے ایک جدید نظام کا خواب آغاز کریں، اور اُس کے لئے ایک نئی خوش گوار زندگی کا خاکہ کھینچیں، کیونکہ حقیقی خوشحالی محبت کا طرب انگیز نتیجہ ہونا چاہیئے۔ ہم کیا اپنے وطن سے عشق و محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں جب تک کہ ہماری نگاہیں مشرق کی طرف جھکی ہوئی ہیں؟

میرا شامیانہ

"زمانہ مکان و ماحول کی ایک قسم ہے"، یہ کہنے کے بجائے کہ "اس واقعہ کو ہوئے ہزار سال گزر گئے" میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ واقعہ فلاں مقام میں، فلاں فضا میں، زمین کی فلاں گردش میں، آفتاب کی فلاں گردش کے وقت ظہور پذیر ہوا، خواہ زمین اور سورج دونوں کی گردشوں کا تعین فضا اور ماحول کے کسی مقام پر ممکن ہو، اس وقت تم اس قول سے وہی سمجھو، جو میں اپنے اس قول "اس واقعہ کو ہوئے ہزار سال گزرے" سے سمجھتا ہوں، بلکہ یہاں میرا فہم و

ادراک اس حادثہ و واقعہ کے لئے نہایت دقیق اور زیادہ واضح ہوگا؟"

میں اُن الفاظ کو اس طرح دہرا رہا تھا، جن کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی، کسی گہرے خیال کو اپنے دل میں اُجاگر کرنا چاہتا ہوں تو میں ایسا ہی کیا کرتا ہوں، کیونکہ لفظ میرے نزدیک معنی کی اساس ہے حالانکہ معنی لفظ کے لئے بنیاد نہیں؛

میں اِسی اثناء میں زمان و مکان کے مابین تمیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ پر ایک مدہوشی کا عالم طاری ہوگیا جس نے قریب قریب مجھے عالم خواب میں پہونچا دیا، پھر عقل ظاہر کی یادداشت عقل باطن کے خوابوں میں تبدیل ہوگئی، پھر ہوش و مدہوشی کے درمیان ذرا وقفہ رہا پھر اُس کے بعد نیند کا غلبہ ہوگیا؛

لیکن نیند تو صرف ظاہری جسم پر طاری تھی، مگر اعصاب اور دماغ کے اندرون تو افکار و خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، نئے نئے زاوئیے اُبھرتے، عجیب و غریب خاکے ہجوم کرتے پھر منتشر و پراگندہ ہو جاتے تھے؛

کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، نہ زمانے کا خیال رہا اور نہ کسی مکان کا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اُس مقام کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہوں، جہاں تاریکی کے پردے چاک ہوتے ہیں اور روشنی کے چشمے

پھوٹتے ہیں، پھر میں نے نسیم سحر کے جھونکوں میں سانس لی، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کئی سال سے میں نے پاکیزہ ہوا نہیں کھائی، میں اپنے بستر سے یہ کہتا ہوا اٹھا کہ "میں نے دیر کر دی، میں نے دیر کر دی" لیکن میں نے جب اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو دوبارہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا، کیونکہ نہ تو یہ کمرہ میرا کمرہ تھا اور نہ یہ بستر میرا بستر، دیوار پر دیکھا تو ایک تختی آویزاں ہے، اور اس پر لکھا ہوا ہے ۲۰ فروری ۳۱۰۵ء۔

میں نے اپنے گردوپیش غائرانہ نظر ڈالی تو دیکھا کہ توشک، تکیہ اور لحاف تمام کے تمام بہترین ہیں، کمرہ نہایت صاف ستھرا ہے، میں نے اپنے دل میں کہا "ہو نہ ہو میں بیمار ہو گیا تھا، مجھے یہ لوگ اس یہودی شفاخانے میں لے آئے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سن یہودی ہے، جو موسیٰ سے شروع ہوتا ہے، اور موسیٰ مسیح سے تقریباً تیرہ سو سال پیشتر آئے تھے، یہ یہودی اپنی تاریخ نہیں بھولتے، لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ مجھے یہاں کس لئے لائے ہیں کیونکہ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں بیمار بھی ہو گیا تھا"

پھر میں نے اپنے جسم پر نظر ڈالی، کہ کہیں اس پر زخم کا نشان یا کسر کی علامت تو نہیں، دیکھا کہ اس میں سے کوئی چیز نہیں، میں نے اپنے حافظہ کی روشنی میں گذشتہ کسی واقعہ کی تلاشی لی، تو میں کسی ایسے واقعہ پر نہیں پہونچا۔

اِس کے بعد میں بستر پر سے اُٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا، مگر میں ابھی دو قدم بھی چلا تھا کہ میرے کانوں سے ایک چیخ ٹکرا گئی، پیچھے مڑ کر میں نے دیکھا، تو ایک دوشیزہ دوڑی جا رہی تھی اور یہ کہتی تھی "سونے والا بیدار ہو گیا، بے ہوش ہوش میں آ گیا"

چند ہی لمحے گذرے تھے کہ میں نے پورے شفاخانے میں یہ جملے گونجتے ہوئے سُنے کہ "سونے والا جاگ اُٹھا" پندرہ منٹ کے بعد سڑک کی ساری فضا میں یہی آواز گونجنے لگی، میں نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑائی؛ میرا یہ حال تھا کہ ضعف و نقاہت سے گر گر پڑتا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک جمِ غفیر عجیب و غریب شکل و صورت کا ہے، یہ تمام مل کر شور کر رہا ہے "سونے والا جاگ اُٹھا، وہ دیکھو وہ دیکھ رہا ہے، وہ بہت کمزور و نحیف ہے، اب وہ زندہ نہ رہے گا، اُس کو بستر پر لے جانا ضروری ہے، کہاں ہیں تیمار دار نرسیں (انیسات) کہاں ہیں اطباء؟" باپ اپنے بچوں کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے بھیڑ میں سے مجھے دیکھنے اور دکھلانے کی کوشش کر رہے ہیں، میں نے کھڑکی کے قریب کی فضا میں نظر ڈالی، تو پچاس چھوٹے طیارے پرواز کر رہے تھے اور اُس کے اندر کے سوار میری طرف نظریں جمائے ہوئے تھے۔

میں اِس نظر فریب منظر میں کھویا ہوا تھا کہ اِتنے میں میرے کندھے پر

کسی نے ہاتھ رکھا، مُڑ کر دیکھا تو ایک دُبلا پتلا آدمی کھڑا تھا، جو دراز چہرہ اور ضخیم سر تھا اُس کے چہرہ سے لڑکیوں کی سی ملاحت ٹپک رہی تھی، مجھ سے شیریں آواز میں کہنے لگا "کیا تو بستر کی طرف واپس جائے گا؟ تو اب تک کمزور ہے۔"

اس کے الفاظ میں ایک قسم کی حلاوت اور شیرینی تھی اور ایک طرح کی برانگیختگی، چنانچہ میں بستر پر چلا گیا اور لیٹ گیا، وہ شخص میرے پلنگ کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا اور میری نبض دیکھنے، زبان کا معائنہ کرنے اور میرے اعضاء جسم کو چھونے لگا، پھر مجھ سے یوں مخاطب ہوا:

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اَب تو صحت پا گیا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ تیری صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے اطباء کی ایک مجلس قائم کی جائے۔

میں نے کہا: "میری بیماری کیا تھی اور مجھے اپنے گھر واپس ہونیکی اجازت کب دی جائے گی؟"۔

وہ یہ سن کر ایک لمبی ہنسی ہنسا، جس میں قہقہہ کی لہریں نہیں تھیں، اور کہا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تو ہر چیز سے ناواقف ہے، اب تجھے یہاں رہے ہوئے ۱۸۰ سال گذر گئے، تیسرا واقعہ بھی عجیب ہے، ۱۹۲۵ء میں تو

دماغی فالج کے مرض میں گرفتار ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے تو نے اپنا حافظہ اور یادداشت کھو دیا، اور تیرے باقی اعضاء جسم اُسی طرح کام کرتے رہے جیسے ہم تندرستی کی حالت میں کام کرتے ہیں، تو سویا ہوا تھا لیکن ہم تجھے برابر غذا پہونچاتے رہے، یہاں تک کہ تیرا فالج زائل ہوگیا اور اب تو ہوش میں آگیا ہے، تو ۱۱۰۰ سال سویا رہا؟"

مگر یہ عجیب گفتگو بھی میری سمجھ میں نہیں آئی، پھر میں نے اُس شخص سے بحث و مباحثہ کرنے کو رائگاں سمجھا، اس کی تمام باتوں سے میں انجان ہوگیا، میں نے پورے جوش اور عزم کے ساتھ کہا" میں اپنے خاندان والوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ وہی ہنسی ہنسنے لگا، اس مرتبہ وہ مجھے نہایت ہلکے پن کی نظر آئی، اس وقت اُس شخص کے چہرہ پر ایسے آثار نمایاں ہونے لگے، جن سے میرے دل میں بہت سے شکوک و شبہات رینگنے لگے اور میں نے اندازہ لگایا کہ یہی میری نظر بندی کا باعث ہیں، میں نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں اُس سے کہا:۔

"اگر میں اپنے خاندان کی طرف نہ جاؤں تو میں اسی کھڑکی سے چھلانگ ماروں گا اور خودکشی کرلوں گا، اس کا ذمہ دار تو ہوگا۔"

اُس کے چہرہ پر قلق و اضطراب کی جھلکیاں نظر آنے لگیں، پھر

میری دلجوئی اور تسلی کرنے لگا اور کہنے لگا۔

"مجلس کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد عن قریب تو یہاں سے رخصت ہو جائے گا، تو کسی چیز سے خوف نہ کھا، ہم تمام تیری بھلائی اور عافیت چاہتے ہیں، کسی چیز کا غم نہ کر، ادھر دیکھ بعض اراکین حاضر ہو گئے ہیں۔"

میں نے دروازہ کی طرف دیکھا تو پانچ یا چھ اشخاص میرے کمرے کی طرف چلے آرہے ہیں، جب وہ داخل ہو گئے تو میں نے خوب غور سے اُن کو دیکھا اُن میں دو عورتیں بھی ہیں، سبھوں نے میرا معائنہ کرنا شروع کر دیا، انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ میری صحت اب بہتر ہے، اور کھانے کے بعد مجھے رخصت ہونے کی اجازت انھوں نے دے دی۔

میرے سامنے مختلف پھلوں کی ایک کشتی لائی گئی، جن کے ناموں سے میں ناآشنا تھا، کوئی پکی ہوئی چیز میرے سامنے نہیں لائی گئی، میں نے کہا:۔

"یہ تو میری غذا نہیں بن سکتی، مہربانی فرما کر مجھے گوشت اور روٹی لا دو، کیونکہ میں شدید بھوک محسوس کر رہا ہوں۔"

ایک شخص نے مجھے نرم لہجہ میں سمجھانا شروع کیا کہ ان پھلوں میں وہ چیز ہے جو میرے جسم کے لئے غذائی ضرورت سے بڑھ کر ہے، ان میں مختلف جسم کے اجزاء، شیرین و نمکین پائے جاتے ہیں، پھر اس نے

اِن تمام پھلوں کو ترتیب وار رکھ دیا، میں نے ان میں سے بہترین پھل کھائے جو مزہ میں گوشت کے مشابہ تھے، پھر میں نے کچھ اخروٹ کھائے، ان سے دُھنیت ٹپکتی تھی، پھر ایک خوشبودار خوبصورت، خوشنما رنگین پھل کھایا۔ اِس لذیذ کھانے کے بعد میں نے سیری و سیرابی محسوس کی۔ پھر مجلس برخاست ہو گئی، وہی پہلا شخص باقی رہ گیا، مجھ سے اُس نے کہا:۔

"کیا اب تو اپنے شہر کی طرف رخصت ہونا چاہتا ہے؟"

"ہاں! یہی تو میں چاہتا ہوں"

میں نے جواب دیا۔

اُس نے مجھے میرا لباس اور پوشاک پہنا دی اور اس کے ساتھ میں باہر نکلا!

میری دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں دیکھا اور وہاں کے باشندے مجھے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑ رہے ہیں، یہ تمام میرے رفیق کی طرح بلند قامت، بھاری سر اور دُبلے بدن ہیں، مرد اور عورت میں صرف اتنا فرق ہے کہ مرد کی صرف باریک مونچھیں ہیں، ڈاڑھی کا حال تو یہ تھا کہ اس کے مقام پر مجھے چند بال نظر آرہے تھے یا بالکل کوئی نشان موجود نہ تھا، اُن کے منہ بہت چھوٹے تھے، اُن سے میرا میل جول بڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اُن کے نیچے

کے جبڑے میں دانت نہیں ہیں، اوپر کے جبڑے کے دانتوں کے صرف نشان باقی رہ گئے ہیں، میرے ساتھی نے مجھے اُن بے شمار اشیاء سے آگاہ کیا، جو میرے ساتھ مخصوص ہیں اور اُس شہر کے راستے بھی جس میں ہم چل رہے تھے، مجھ سے اُس نے بیان کیا کہ میں نے کس طرح نباتی زندگی بسر کی اور میں اپنے بستر کی سطح سے چپک گیا تھا، میرا حافظہ اور میری قوت فکریہ سو چکی تھی۔ نیز کس طرح اس زندگی کی بدولت مجھے اتنی طویل عمر نصیب ہوئی، کیونکہ میں اُس درخت کی مانند ہو گیا تھا جو پابگل ہے اور بہت کم نقل و حرکت کرتا ہے، کیونکہ میرے مالوں میں ترقی ہوتی گئی چنانچہ میں اب سب سے زیادہ تونگر اور مالدار ہو گیا ہوں ۱۹۲۵ء میں میں پچاس ایکڑ زمین کا مالک تھا، مجھ پر فالج کا حملہ ہونے کے بعد صرف دس ایکڑ زمین خرچ کی گئی، باقی زمین میں میرے نام سے برابر اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ میری اولاد میری کسی چیز کی وارث نہ ہو سکی نہ وہ خود اور نہ اُن کے پوتے، کیونکہ کسی محکمہ کو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری موت کا اقرار کرے، اس طریقے سے میرے مال میں روز افزوں اضافہ اور ترقی ہوتی گئی، پھر اس نے میرے روبرو مصر کی گذشتہ ہزار سالہ تاریخ بیان کی، کس طرح اس کے اندر اشتراکی انقلابات رونما ہوئے کیونکہ حکومت کے پہلے تجربات ناکام ہوئے، پھر اُس کے نتیجہ میں موجودہ

نظام رائج ہوا، میرے شفا خانے کے نکلنے کے پہلے ہی دن سے مجھے اُس نے مصر کے بعض ایسے مناظر دکھلائے جن کی فضاؤں میں میں اپنے مرض سے پیشتر سانس لیا کرتا تھا، اس نے میرے سامنے سینمائی پردۂ سیمیں کی طرح وہ تمام حالات پیش کئے جن میں میں نے اچھی طرح اپنے وطن کو دیکھا، پھر دوسرے اور تیسرے سو سال کے حالات پیش کرتے ہوئے میرے شامیانہ یعنی مصر کے موجودہ دور کے مناظر تک مجھے پہونچا دیا،

اَب میرے ذہن میں یہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ اُس نے میرے مرض کے متعلق جو خبر دی تھی، وہ صحیح ہے، میں اپنی گذشتہ زندگی کے دَور میں نظریۂ ارتقاء سے کچھ روشناس تھا، بلکہ میں اس پر یقین و ایمان رکھنے کے لئے اوروں کو دعوت دیا کرتا تھا، پھر تو میرے لئے اب کوئی دشواری نہ تھی کہ میں اس نظریہ کی روشنی میں موجودہ حالات کو دیکھوں، لیکن میرے اس نظریہ کے علم نے میری کچھ بزرگی گھٹا دی، کیونکہ میں اپنے آپ کو اس طرح محسوس کر رہا تھا کہ گویا ان لوگوں سے میں تقریباً ۱۲۰۰ سو سال پیچھے ہوں، گویا میں اُن کے درمیان ایک ٹھوس زندہ اِنسان سے قائم مقام ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے اِس خیال کے برعکس میری طرف دیکھ رہے تھے، میں دیکھ رہا تھا کہ اُن کی آنکھیں میرے چہرے پر مرتکز ہو رہی ہیں اور میری دماغی ہئیت کا

جائزہ لے رہی ہیں، اُن کے بچے کبھی تو میری ڈاڑھی چھونے پر جرات کیا کرتے اور اُس کی کھردراہٹ پر تعجب کیا کرتے اور کبھی اُن کو میرے چھوٹے سر سے تعجب ہوتا تھا؛

شام کے وقت میں اپنے کمرہ میں واپس ہوگیا، وہاں میری تیماردار (نرس) بیٹھی ہوئی تھی، اور میرے لئے میوہ جات کا کھانا بھی لے آئی تھی؛ مجھے میرا ساتھی یہاں پہونچا کر چلا گیا تھا، نرس سے میں نے گفتگو شروع کردی، کمرہ کی اس تنہائی میں میں نے اپنے اور اس دوشیزہ کے مابین خاندانی شعور کا احساس کیا، میں نے اس سے یہ معلوم کیا کہ وہ تقریباً تیس سال سے میری تیمارداری میں مصروف ہے، یہ تنہا اس کے لئے کافی تھا کہ میں اُس پر دیرینہ دوستی کا حق جتلاؤں، پھر اس نے میرے ایام مرض کے حالات سب مجھے سنائے یہ داستان بہت زیادہ دراز نہ تھی، کیونکہ وہ مجھے اپنی سابقہ زندگی کا خلاصہ بیان کر رہی تھی، اُس نے بیان کیا کہ میں بے ہوش تھا، میری یہ بے ہوشی بعض اُن جانوروں کے مشابہ تھی جن پر عمل جراحی ہوتا ہے، وہ تین یا چار مہینے بے ہوش پڑے رہتے ہیں، اور کچھ کھاتے پیتے نہیں، اُن کے جسم کی نشوونما کا دارمدار تنفس پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت سست رفتاری کے ساتھ دَوران خون کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جب اطباء نے دیکھا کہ میں عن قریب لازمی طور پر مرنے والا ہوں جب کہ میں غذا نہ حاصل کروں، تو

اُنھوں نے میری رگوں میں تقریباً مہینہ میں ایک مرتبہ غذائی مادوں کو پچکاری کے ذریعہ پہونچانا شروع کیا، یہی پچکاری میری زندگی کی سانس کو تھامے رہی، طبیبوں نے میرے ساتھ اسی طریقہ کو مسلسل جاری رکھا، اُنھوں نے مجھے اعجوبۂ روزگار بنا دیا، یہاں تک کہ میرے متعلق یہ کہا گیا کہ میری اِس زندگی سے متعلق کتابیں لکھی گئیں، بعضوں نے یہ گمان کیا ہے کہ میں دیگر تمام اِنسانوں سے بعض جدا شدہ گلٹیوں کی ترکیب و ساخت میں مختلف اور جُداگانہ ہوں، بعضوں نے میری موت کے بعد میرے جسمانی اعضاء کو چیرنے پھاڑنے اور مشاہدہ کرنے کا خیال کر لیا تھا، لیکن میں نے اُن کے گمان کو پلٹ کر رکھدیا کیوں کہ میں ہوش میں آگیا اور تندرست ہوگیا۔

دوشیزہ شیریں لہجہ میں مجھ سے گفتگو کر رہی تھی جس میں نمکینی بھی آمیز تھی، یہ دراز قد اور ضخیم سر تھی، اس کا سینہ دوسری عورتوں کی طرح اُبھرا ہوا نہ تھا، گویا سرے سے اس کا جوبن ہی غائب تھا، وہ اپنے فرزندانِ زمانہ کا سا لباس پہنے ہوئے تھی، پنڈلیاں، ہاتھ اور سر عریاں اور جوتا بلا پا تابے کے تھا، اُس کے جسم پر سوائے جالی دار کشادہ ٹکڑے کے اور کوئی کپڑا نہ تھا، یہ جامہ گردن سے پنڈلیوں تک تھا، مرد اور عورتیں دونوں اِس طرح کی پوشاک پہنے ہوئے تھے، سر کے بال لٹکے ہوئے تھے، جو کچھ چہرہ پر اور کچھ گردن کو ڈھانکے ہوئے تھے:

مجھے اِس دوشیزہ سے، جس کا نام مجھے "رادیم" معلوم ہوا، الفت ہوگئی، میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی مجھ سے مانوس ہوگئی ہے، اس کی نگاہوں میں مجھے محبت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں، کیونکہ میں اس کی آنکھوں میں وہ کم مائگی اور حقارت آمیزی نہیں دیکھتا تھا، جو مجھے اپنے تمام شامیانہ والوں میں نظر آتی تھی، جب کہ وہ میرے سر کی شکل و ہیئت میں غور و فکر کرتے تھے اور یہ سوچتے تھے کہ حجم میں اُن کے سروں سے میرا سر بہت چھوٹا اور کم ہے، یہ دوشیزہ اُن کے حالات ان کی معیشت اور اُن کے نظام زندگی کے متعلق ہر چیز کی تشریح میرے سامنے کرتی تھی، ہر روز میرا ربط و تعلق اُس سے بڑھتا جاتا تھا اور میرا اس پر اعتماد پختہ ہوتا جاتا تھا؛ چنانچہ میں اُس کے پہلو میں اِس طرح کھڑا ہو جاتا جیسا کہ کوئی بچہ اپنی ماں کے پہلو میں ہوتا ہے؛

اُس نے مجھے ان کی غذا کی تفصیل بتائی، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ پخت و پز سے ناواقف ہیں اور وہ جانور کو ذبح نہیں کرتے کیونکہ اُنھوں نے ایسے مختلف میوہ جات اور پھلوں کو اُگا رکھا ہے؛ جن میں سے بعض غذائی منفعت کی خاطر اور بعض دوائی اغراض کے تحت استعمال کرلئے جاتے ہیں، وہ اپنی بعض غذاؤں مثلاً نشاستہ اور شکر کو جمادات یعنی کیمیاوی ترکیبوں کے ذریعہ حاصل کرلیتے ہیں،

زراعت واقف کار اور فن داں اشخاص کے ہاتھوں میں ہے، اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک معمل ہے، جس میں وہ نئے نئے تخم پیدا کرتا ہے؛ اس میں مختلف شیریں، نمکیں اور تلخ ناک ذائقوں کے ساتھ غذاؤں کا امتحان کیا جاتا ہے، وہ پھلوں پر غذائی حیثیت سے ہی توجہ صرف نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ اُن کے رنگ اور شکل وہئیت پر بھی نظر رکھتے ہیں، اِس طرح پر کہ انسان اس وقت تک دسترخواں پر نہ بیٹھے، جب تک کہ وہ ایسی اشیاء نہ دیکھ لے، جس سے قوت باصرہ اور قوتِ شامہ غذا نہ حاصل کر سکے، جیسا کہ وہ زبان کی لذت یابی کا اہتمام کرتا ہے؛

اُن کے مکانات نہایت عجیب وغریب تھے، بعض اِس قسم کے بنے ہوئے تھے، کہ ایک مکان کے اندر اُن کے تقریباً دو سو اشخاص سما سکتے تھے، جن کی طبیعت میں میل جول اور الفت کی طرف زیادہ رجحان تھا، اس کے ساتھ ساتھ کشت زاروں کے درمیان علیحدہ مستقل مکانات تھے، جن میں دلدادگان تنہائی زندگی بسر کرتے تھے، یا وہ کسی خاص موضوع کے درس ومطالعہ میں منہمک ہوتے تھے، جس پر وہ اپنی تمام قوتیں اور اپنا سارا وقت خرچ کر دیتے تھے، اُن کے لئے انفرادی زندگی بسر کرنا نہایت سہل تھا، کیونکہ ہر شخص اپنی انفرادیت اور وحدت میں تمام اجتماعی اسباب فراہم

کرلیتا تھا، اپنے کمرہ میں فضائی ٹیلیفون کا سامان دھرا ہوا پاتا ہے، جس کے ذریعہ رات اور دن کے کسی لمحہ میں تقریریں، خبریں اور لکچر سن سکتا ہے جب وہ اپنے دوست سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کی تصویر اُس کے روبرو حاضر ہو جاتی ہے، اور اس کی آواز کو یہ سُن لیتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے، شہروں میں وہ گرد و غبار نظر نہیں آتا جس کو ہم دیکھتے ہیں، کیونکہ تمام سڑکیں حتیٰ کہ زراعتی راستے بھی لکڑی کی چھتوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، دونوں طرف بجلی کے قمقمے روشن ہیں، اسی طرح گھروں میں جھاڑو دینے اور اُن کی پاکی صفائی کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ گھر کا سارا ساز و سامان نظافت اور صفائی سے بنایا جاتا ہے، کمرے نہایت ہوادار اور روشن ہیں، اُن میں بجلی کے پنکھے بھی گھومتے ہیں، تقریباً ہر شخص کے لئے ایک خاص موٹر کار یا چھوٹا سا طیارہ ہے، یہ دونوں بھی بجلی سے چلتے ہیں۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی زندگی عام طور پر محسوس طریقے سے انفرادی ہے ——————— لیکن معنوی اعتبار سے اُن کی اس انفرادی زندگی میں بیشتر اجتماعی آثار جھلکتے ہیں، کیونکہ میں ان میں سے کسی ایسے انسان کو نہیں پہچانتا،

جو ہر روز گانا نہ سنتا ہو یا ڈراما نہ دیکھتا ہو، جو اُس سے ایک ہزار میل کی مسافت پر پیش کیا جا رہا ہے، یا اپنے ان دوستوں سے، جو اس سے دور دیگر ملکوں میں بستے ہیں، کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ گفت گو نہ کرتا ہو، اُن کا درشن نہ کرتا ہو اور اُن سے ہنسی مذاق کی باتیں نہ کرتا ہو، ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ہوائی یا زمینی سواری ہے، جو اُن کی حسب مرضی ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہوتی رہتی ہے۔

باوجودے کہ میں اُن کے حالات سے متعجب ہوا، لیکن مجھے اس سے انکار نہیں کہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ گھریلو اور معاشرتی زندگی سے جیسا کہ ہم روشناس ہیں، واقف نہیں ہیں، میرا دم گھٹنے لگا، میرا یہ رنج و اَلم اور بڑھ گیا جب کہ میں نے رادیم کو اس قسم کی زندگی سے بے خبر پایا، رادیم کے ساتھ میرے جذبات و احساسات میرے دل میں ازدواجی زندگی کی کیف آور لذت کے وسوسے پیش کر رہے تھے، چنانچہ میں اس کو اپنی معشوقہ اور بیوی فرض کرتا تھا میں اور وہ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے اور بستے ہیں، نیز میرا خیال تھا کہ میں اور وہ دونوں ایک ساتھ مل کر کھائیں گے، ہماری اس دو طرفہ محبت کے پھل ہمارے بچے ہوں گے، جن کو ہم دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں کیف و سرور محسوس کریں گے، اور ہم اُن کو مادری و پدری لذت کے ساتھ پرورش کریں گے۔

دوشیزہ راد یم ہی اپنے ہمجنسوں میں عاشقانہ جذبات اور محبت آمیز میلانات سے کوسوں دُور نہیں تھی، بلکہ یہ تمام کے تمام جمود وبرودت کا شکار ہو چلے تھے، یہ اپنے جذبات وعواطف سے محسوس کرنے کی بہ نسبت زیادہ تر اپنی عقلوں سے دیکھتے تھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اُن میں سے کسی کو بھی میں نے اِنتہائی طیش وغضب میں یا اِنتہائی خوشی ومسرّت میں دیکھا ہو، اُن کا زیادہ سے زیادہ غصہ کڑھ جانا اور اُن کی حد سے حد خوشی لبوں پر مُسکراہٹ کی ایک لہر دوڑا دینا یا لطیف ہنسی ہنس دینا تھا، شادی اُن کے پاس عشق ومحبت کے جذبات پر رائج نہ تھی، بلکہ اُس کا مقصد تھا معیشت، غرض وغایت اور نسل کی برآمد، جب کوئی شخص کسی دوشیزہ کے متعلق یہ سنتا کہ وہ اُس کے مضامین دلچسپی سے پڑھا کرتی ہے اور جو کچھ وہ پڑھتا ہے یہ بھی وہی پڑھتی ہے، تو دونوں میں خط وکتابت ہوتی، اِس مراسلت کا انجام محبت والفت کی شکل میں ظاہر ہوتا، اور وہ ایک ہی مقام پر زندگی بسر کرتے، لیکن اِس کے باوجود نسلی غرض وغایت پورا کرنے کے وہ روادار نہ تھے، تاوقتیکہ حکومت کی طرف سے یہ شہادت نہ پیش کردیں کہ وہ دونوں نسلی تعلقات کے لائق ہیں۔

یہاں کی حکومت کی نظر میں نسل کی برآمد نہایت خطرناک سمجھی جاتی تھی، درحقیقت جب میں نے اُن کے حالات کو گہری نظر سے دیکھا،

تو معلوم ہوا کہ وہ تمام اِس کے قابل ہیں کہ نسل کی طرف توجہ مرکوز کی جائے اُن لوگوں کے ذہنوں میں یہ اَمر جاگزیں ہوگیا ہے کہ انسان گزشتہ زمانے میں بندر کے مشابہ تھا، اگر اس پر انتخابی نظر توجہ کی جائے تو وہ عواطف و جذبات اور عقل و فراست کے اعتبار سے ترقی یافتہ حیوان تک ترقی کرسکتا ہے، اِس نظریہ کی تائید اور اُس کی جراءت کرنے کے لئے وہ سینمائی الواح مساعد ہوئیں، جنھوں نے اُن کے روبرو دو ہزار سال کی تاریخ پیش کی، اُن کے ذریعہ سے اُنھوں نے معلوم کیا کہ اُن کے آباء و اجداد کے حالات کیا تھے اور وہ ترقی کے کس پست درجہ میں تھے، پھر رفتہ رفتہ اُنھوں نے کس طرح ترقی کی اور اَب موجودہ حالت تک پہونچ گئے، اُن میں سے کوئی ایسا شخص نہیں جو آباء و اجداد کے مجد و شرف میں حکتہ چینی کی طاقت رکھتا ہو، کیونکہ اُن کی بزرگی سینمائی تختیوں پر ظاہر ہو رہی تھی، اُس وقت زرد چہرے، گرد و غبار کی گھٹائیں، گندہ سڑکیں اور چھوٹے سر نظر آرہے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ایک دکان کا منظر دیکھا، جس کی تصویر ۱۹۲۴ء میں قاہرہ سے لی گئی تھی، تو میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، مجھے نہایت تعجب ہونے لگا کہ ہم کس طرح اُس گندگی کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے؛

جب کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا تھا تو گھر میں طبیبوں اور عالموں کی ایک

جماعت حاضر ہوتی اور اُس کے جسم کا معائنہ کرتی، اگر اُس کو زندگی کے سزاوار پاتے تو چھوڑ دیتے ورنہ اس کو اسی گھر میں ہلاک کر دیتے، ماں باپ اس حرکت سے غضب ناک نہیں ہوتے تھے، میں اُن سے سنا کرتا تھا کہ ہلاک ہونے والے بچوں کی بڑی تعداد وہ تھی، جن کے متعلق یہ شبہ ہوتا کہ وہ اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جائیں گے اور پھر اُن کے سر چھوٹے ہو جائیں گے۔

میں نے رادیم سے اِس موضوع پر اکثر مرتبہ گفت گو کی، میں نے دیکھا وہ بچوں کے قتل سے ذرا نہیں گھبرائی، اس نے مجھے نہایت ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ وہ ایسے بچوں کی موت کو دوسرے جانوروں کی موت سے بڑھ کر محسوس نہیں کرتے، نیز قوم کی بہتری اور آنے والی نسلوں کی مصلحت اسی کے مقتضی ہے، اُن کی تربیت کا جو طریقہ اور اسلوب تھا وہ میری نظر میں بہت اچھا معلوم ہوا، بچہ اپنے ماں باپ کے ساتھ چھ سال تک رہتا ہے، اِس کے بعد مدارس کو بھیج دیا جاتا ہے، جہاں وہ لذیذ علمی تعلیم حاصل کرتا ہے، جغرافیہ، تاریخ، اور نیز تاریخ طبیعی کی تعلیم سینمائی الواح کے ذریعہ دی جاتی ہے بچہ، جو دس سال سے بڑا نہیں ہوتا، ہمارے ان بچوں کی بہ نسبت جو ہمارے قدیم مدارس میں تیس سال کی عمر میں جس قدر معلومات

حاصل کرتے ہیں، یہ بچہ اُن سے بڑھ کر صحیح طریقہ سے اُن چیزوں کی صحیح معلومات حاصل کرلیتا ہے، مدرسہ میں دارالاقامہ اور کتب خانہ ہے، طالبعلم سے دو اِمتحان لئے جاتے ہیں، ایک اِمتحانِ حضارۃ (تہذیب و تمدن) جو نظام حکومت، زراعت اور کیمیاء کے مختلف آلات کی ترکیب وغیرہ اِس قسم کے اُمور سے مخصوص ہے، جن پر تمدن وحضارت کا اِنحصار ہے، دوسرا اِمتحانِ ثقافتہ جس میں قوموں کی تاریخ، قدیم اِنسان کی تاریخ اور اُن مختلف فلسفیانہ علوم کا درس دیا جاتا ہے، جو گذشتہ صدیوں سے اِنسانی ذہن و دماغ کی پیداوار ہیں، نیز ادیان ومذاہب اور آداب وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، طالب علم چالیس سال قبل مدرسہ کو چھوڑنے کا عادی نہیں ہوتا، یہ مدت دراز نہیں ہوسکتی، جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اُس شامیلنے والے تقریباً ڈیڑھ سو سال کی عمر تک زندہ رہتے ہیں، نوجوانوں کو دور دراز خطّوں کی سیر و سیاحت کے ذریعہ مختلف قسم کی تربیت دی جاتی ہے، مثلاً اُن کو قطب جنوبی کے برفستانی خطّوں میں، دور دراز جنگلوں میں، یا پہاڑوں کی بلند چوٹیوں میں بھیجا جاتا ہے، جب نوجوان مدرسہ سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو تقریباً ساری دنیا کی سیر و سیاحت کر چکا ہوتا ہے۔

کسب معاش اور محنت و مزدوری کا نظام تقریباً وہی ہے، جس کو

ہم اپنے زمانے میں اشتراکیت کے علمبرداروں کی زبانی سُن رہے ہیں، یہ خطہ مختلف اضلاع میں منقسم ہے، اس کے بہت سے گاؤں ہیں ہر گاؤں تقریباً ہزار ایکر زمین پر مشتمل ہے، یہاں ایک کارخانہ ہے زراعت کا کاروبار بہت کم ہے، کیونکہ اس ہزار ایکر زمین میں سے صرف پچاس یا ساٹھ ایکر رقبہ میں اجنبی پودوں کی سالانہ کاشت ہوتی ہے، اس کے علاوہ ساری زمین سن رسیدہ درختوں سے معمور ہے، اُنھیں سے غذا، لباس اور ایندھن حاصل کیا جاتا ہے، دریائے نیل سے اب پانی سینچنے کی ضرورت نہیں رہی، جیسا کہ ہمارے عہد میں ہو رہی ہے، کیونکہ یہ نہر اب تقریباً خشک ہو چکی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خطہ کے باشندے بادلوں کو اپنے علم کے قابو میں کئے ہوئے ہیں، ان بادلوں پر طیاروں کے ذریعہ بلند ہو جاتے ہیں اور ان پر کیمیائی مادے چھوڑ دیتے ہیں، یہ مادے بادلوں کو بوجھل اور کثیف بنا دیتے ہیں اور جس سمت اور جس گھڑی یہ چاہتے ہیں، وہاں بارش ہونے لگتی ہے، گاؤں کے کارخانے تقریباً ہر چیز تیار کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہر گاؤں اپنی معاش اور اپنے کاروبار میں دوسرے گاؤں سے مستقل اور منفرد ہے، صرف تھوڑی اشیاء ہیں جن میں اس کو تبادلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس خطہ کا کوئی شخص اپنی معاش اور گذر بسر کے لئے روزانہ ایک گھنٹہ سے

زائد کام کے سوا کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اپنا سارا دن اور پوری رات مختلف ذہنی لطف اندوزیوں اور علمی بحثوں میں گذارتا ہے، کیونکہ بہت کم افراد خواہ مرد ہوں یا عورتیں، ایسے ہیں، جو اپنی فرصت کے اوقات کو علمی مباحثوں میں نہ گذارتے ہوں؛

میرے شاہیانہ کی حکومت کا نظام پانچ اِداروں سے ترکیب پایا ہے:

(۱) ادارۂ تشریعی۔

(۲) ادارۂ قضائی۔

(۳) ادارۂ صحافتی۔

(۴) اِدارۂ دینی۔

(۵) اِدارۂ تنفیذی۔

ادارۂ تشریعی میں وہ افراد مندوب نہیں ہوتے، جن کو ہم آج کل منتخب کیا کرتے ہیں بلکہ اُن کو مختلف جماعتیں منتخب کرتی ہیں، چنانچہ اطباء میں سے ۱۰، ماہرین علم الحیات میں سے ۱۰، ماہرین زراعت میں سے ۱۰ اور نجاروں (بڑھئی) کی جماعت میں سے ۱۰ ارکان انتخاب کر لئے جاتے ہیں اس طرح ہر گروہ کے علٰحدہ رکن ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اس مجلس کے پانسو ارکان ہو جائیں، تب قانون نافذ کرنے کا اس مجلس کو پورا اِقتدار حاصل ہوگا؛

اِدارۂ قضائی، بہ نسبت دوسرے اِداروں کے قوم میں بہت کم ظہور پذیر ہوا کرتا ہے کیونکہ تقاضا کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، قاضیوں کا اِنتخاب حسب عادت ماہرینِ عمران و اربابِ علم الحیات کے گروہ سے کیا جاتا ہے، تاکہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ کون واجب القتل ہے، یا کون ایسا ہے جس کو نسلی تعلقات سے باز رکھا جائے؛

ادارۂ صحافت میں درحقیقت چند اشخاص کام کرتے ہیں، مثلاً ایک شخص روزانہ اخبار خواہ وہ بجلی کے ذریعہ ہو یا کیمیائی طور پر شائع ہوا ہو نکالنے میں مشغول ہوتا ہے، دوسرا شخص اَدبی رسالہ نکالتا ہے، تیسرا علمی وعلیٰ ہذا القیاس، یونیورسٹیوں میں رسالے نکالنے کے لئے مخصوص اشخاص ہوا کرتے ہیں، اُن کے پاس جامعاتی نظام ہمارے موجودہ نظام سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔

ادارۂ دینی عام فلاسفہ کی ایک جماعت سے تشکیل پذیر ہے، اس کی رُکنیت کے لئے ستر سے کم عمر شخص قابل قبول نہیں ہوسکتا، قوم کے مذاق اس کے مزاج اور اس کے قصد و ارادہ میں اُس کی رائے کا اَثر ہوگا اور اس کو برتری حاصل ہوگی، یہ ادارہ تاریخ کی تدریس کا طریقہ معین کرتا اور بعض مشاہیر تاریخ کے مجسموں کو بنانے یا اُن کو منہدم کرنے کا فیصلہ صادر کرتا ہے، جمالیاتی نقطۂ نظر یا دیگر اِنسانی ضروریات کے پیش نظر میدانوں میں

مجسمے نصب کرتا ہے، اسی طرح موسیقی، تصویر اور رقص کا حال ہے، کہ یہ ادارہ اُس میں اپنے احکام و اختیارات کو پوری طرح استعمال کر سکتا ہے، کیونکہ میرے شامیانہ والے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان کا مذہب و تدین اس لایق ہے کہ بجائے اس کے کہ سطح قلب سے چند عقائد کو یاد کر لینے سے تکوین پائے، ان چیزوں کے ذریعہ سے بھی تشکیل پذیر ہو، اس خطہ میں بسنے والوں کے عبادت خانے ہیں، جہاں وہ علحدہ طور پر عبادت کیا کرتے ہیں، عبادت خانہ سے مراد ایک بڑی دراز عمارت ہے، اس کی چہار دیواروں پر چند تصویریں ہیں، جو اوّلین زندہ شی کا منظر پیش کرتی ہیں، پھر کیونکر وہ انسانی شکل و صورت میں ترقی کر گئی، پھر فلاسفہ نے اس کے متعلق کس قسم کے خیالات پیش کئے، اور اس کے ذریعہ انسان کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کیں، دوسری تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان بڑے سر والا ہے، اُس کی دو بڑی آنکھیں ہیں، نہایت وجیہ اور خوبصورت ہے، دونوں بازو نازک اور اُنگلیاں پتلی ہیں، دوسری دیوار پر دیگر تصویریں آویزاں ہیں، جو صنعتی ارتقاء کو دور الحجر کے انسان سے اس خطہ کے باشندوں کے دور تک کا منظر پیش کرتی ہیں، ایک اور دیوار پر اس عالم میں زمین کے مرکز اور اس کی طرف نسبت دینے کے لئے ایک عجیب و غریب تصویر ہے، زمین کے اُوپر ایک انسان کھڑا ہوا زمین کے

مرکز کو اس وسیع و عریض فضا میں غور و فکر کر رہا ہے، چوتھی دیوار پر فلسفیوں اور انبیاء کرام کی تصویریں ہیں، اُن میں سے ہر ایک کے لب پر حکمت و صداقت میں ڈوبا ہوا کلمہ لہرا رہا ہے، جو نہایت موثر ہے اور جس کا گہرا اثر تاریخ پر ثبت ہے، اِس خطہ میں بسنے والا عبادت گھر کو اس لئے جاتا ہے کہ اگر اُس نے اپنی زندگی میں کوئی غلطی کی یا اس سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو یہاں آکر وہ درست ہو جائے، اِس وقت وہ یہاں تنہا بیٹھ جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کائنات سے ہم آغوش ہو جائے اور اس کے مرکز اور اس کی اہمیت کو معلوم کرے، تاکہ اس کا دل مطمئن ہو جائے اور اس کا ضمیر ہدایت کی روشنی سے روشن، جب اُس کے دل میں غم کا اثر جھلکنے لگتا ہے تو وہ کسی دینی شخص کی طرف رُخ کرتا ہے، یہ اُس کو درس دیتا ہے اور اُس کی طرف اپنی توجہ صرف کرتا ہے اور اُس کے لئے ایسے دروازے کھول دیتا ہے جن سے اُس کا دل خوش ہو جائے۔

اِدارۂ تنفیذی حکومت کے خاص اور عام عہدہ داروں سے مرکب ہے، اُن کے ذمہ تمام اداروں کے اِنتظامات انجام دینا اور تمام اداروں کے لئے اَحکام صادر کرنا ہے۔

افراد کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ فرد اپنے ماں باپ کے ساتھ چھ سال تک رہتا ہے، پھر وہ یونیورسٹی کو چلا جاتا ہے اور چالیس سال

تک اسی میں رہتا ہے، اس دوران میں وہ اس کے ماں باپ کو دیکھتا رہتا اور اُن کی معاش میں شریک رہتا ہے، پھر یہاں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے اور کسی دیہاتی صنعت میں مصروف ہو جاتا اور اس پیشہ ور جماعت کی طرف منسوب ہو جاتا ہے، اس وقت اُس کو حق پہونچتا ہے کہ وہ قوم کی کسی مصلحت کے بارے میں کچھ سوچ بچار کرے اور رائے زنی کرے، کیونکہ اس کو اس کے ذریعہ سے اِدارۂ تشریعی میں اور قاضیوں میں اور کبھی ارباب صحافت میں انتخاب کرلیا جاتا ہے، یہ شرکت اور باہمی تعاون سے کام کرتا ہے جب ایک سال گزر جاتا ہے تو یہ جائزہ لیتا ہے کہ اس کی کمپنی نے گاؤں کے زراعتی اور صناعتی پیداوار کو کتنا فروخت کیا اور کس قدر خریدا، پھر منافع ہر فرد کے کام کی نسبت تمام پر تقسیم کردیئے جاتے ہیں، محنت کا صلہ تقریباً تمام اعضاء وارکان کے درمیان مساوی ہے، کیونکہ مال کی قدر و قیمت یہاں کے باشندوں کے پاس گھٹ گئی ہے، لیکن یہاں بعض ایسے افراد ہیں، جن کے خصوصی رجحانات ہیں، مثلاً وہ ایک چھوٹے سے گھر کے مالک ہیں، یہ اُس کو اپنی مرضی کے مطابق آراستہ کرتے ہیں، یہ لوگ اوروں کی بہ نسبت زیادہ کام کرتے ہیں، تاکہ اُن کے پاس مال کی بہتات ہو، جس کے ذریعہ وہ غذاء کے ساتھ ساتھ زیب و زینت کا بھی مظاہرہ کریں، گاؤں کی نمائندہ اور نگران کارجماعت ان چیزوں ہیں

سدِ راہ نہیں بنتی، بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے، کہ ان جائدادوں کا انجام مالکوں کی وفات کے بعد کیا ہونے والا ہے کیونکہ میراث کی اصلیت ہی کو عرصہ ہوا، کالعدم قرار دیا گیا، اِس شامیانہ کے باشندوں کے لئے جو بڑا خرچ ہے وہ کھانے اور موٹر کار اور طیّارہ کا ہوتا ہے، رہنے کے لئے گھر ہر فرد کو مفت دیا جاتا ہے اسی طرح پانی، روشنی اور حرارت بھی مفت دی جاتی ہے، نگران کار جماعت کے لئے گودام ہیں، جس میں غذا اور لباس نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔

شامیانہ والے کثرت نسل کو اچھا نہیں سمجھتے بلکہ بہتر سے بہتر نسل پر توجہ کرتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں مصر کی مردم شماری تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ تھی لیکن ۳۱۰۵ء میں صرف ایک کروڑ تک گر گئی، مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو فلسفہ سے ناواقف ہو یا دیگر علوم و معارف کی ایک بڑی مقدار کو نہ جانتا ہو، اُن میں سے بہت کم افراد ایسے ہیں، جو دنیا کی سیر و سیاحت کئے بغیر مر جائیں، کیونکہ وہ اِس حقیقت سے روشناس ہیں کہ انسانوں کی سیرت و کردار کے ذریعہ عبرت حاصل ہوتی ہے نہ کہ انکی تعداد سے؛

ابن عربی اندلسی کہتے ہیں۔

"کسی انسان کو یہ سزاوار نہیں کہ وہ اپنی ہمت کو عالم بیداری کے خوابوں میں اس طرح خرچ کردے کہ وہ اپنے خیال پر حکمران ہو، جو نیند کے عالم میں اس کی عقل پر تصرف کرے جیسا کہ اس پر حالت بیداری میں حکمران تھا........"

بالفاظ دیگر ہم عالم بیداری میں جس چیز کی تمنا اور آرزو کرتے ہیں نیند میں بھی اسی کو دیکھتے ہیں، بنابریں تم اس کے بعد خوابوں کو حقیر نہ سمجھو۔

4.4.57

نفیس ترین لٹریچر

تاریخی و سیاسی

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ ۔ سید عبدالباہی ۱۲/

ہندوستان کی سیاسی الجھنیں ۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۔ دو روپیہ بارہ آنہ

اچھوت اور ہندوستان ۔ علامہ عبدالقدوس ہاشمی ۱۲/

تصورات پاکستان ۔ قائد اعظم محمد علی جناح ۱۲/

تشریحات پاکستان ۔ علامہ عبدالقدوس ہاشمی ۱۴/

معاشیات پاکستان ۔ ایضاً ۱۰/

ہمارا پاکستان ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ۱۲/

اسلام کے سیاسی تصورات ۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید ایم ۔ اے عثمانیہ ۱۲/

حکومت الٰہیہ ۔ رئیس احمد جعفری ۱۴/

اسلام کا نظام حیات ۔ عبدالوہاب المہوی ۴/

نازیت ۔ شاہد رزاقی ایم ۔ اے ۱۲/

قائدین کے خطوط جناح کے نام مترجمہ عبدالرحمٰن سعید ۔ دو روپیہ

گاندھی جناح مراسلت ۔ بارہ آنے

افادات محمد علی ۔ رئیس احمد جعفری ۱۲/

مقالات جمال الدین افغانی ۔ مبارز الدین رفعت ایم ۔ اے ۔ دو روپیہ چودہ آنہ

مقام جمال الدین افغانی ۔ مبارز الدین رفعت

اسلام کا نظام عدالت و سیاست ۔ پروفیسر یعقوب الرحمٰن عثمانی جامعہ عثمانیہ ۔ دو روپیہ ۱۲/

اسلام اور سود ۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی تین روپیہ

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ۔ علامہ مناظر احسن گیلانی تین روپیہ ۸/

اقبالیات

فلسفۂ عجم۔ علامہ اقبال تین روپیہ دو آنہ

تصورات اقبال۔ شاغل فخری۔ " چھ آنہ

حکمت اقبال۔ مرتبہ غلام دستگیر رشید۔ چار روپیہ

رموز اقبال۔ ڈاکٹر میر ولی الدین دو روپیہ ۸/

اسلامی۔ ادبی۔ تاریخی۔

نئے ادبی رجحانات۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۸/

نثر ریاض۔ خیرآبادی۔ مضامین ریاض۔ مرتبہ عقیل جعفری؛ دو روپیہ آٹھ آنے

جگر مرادآبادی۔ حالات۔ تبصرہ۔ انتخاب کلام تبسم نظامی۔ دو روپیہ آٹھ آنے۔

زہریلے آنسو۔ قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ۔ (زیر طبع)

جہان آرزو۔ علامہ آرزو لکھنوی۔ عہ/۱۲

ذکر جمیل۔ نعتیہ کلام ماہر القادری عہ/۸

فلسفۂ امن۔ احمد حسین نقوی (زیر طبع) عہ/۸

علمائے سلف۔ نواب صدر یار جنگ بہادر (ایضاً) عہ/

سیر افغانستان۔ علامہ سید سلیمان ندوی عہ/۸

داستان کربلا۔ سعید صدیقی۔ عہ/۱۲

تاجدار دو عالم۔ عبدالرحمن عزام بے عہ/۱۲

قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم۔ غلام محمد بی اے عہ/۱۲

امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ علامہ مناظر احسن گیلانی۔ چار روپیہ۔

فکر فرنگ۔ آغا افتخار حسین بی اے عہ/۸

کرنل لارنس۔ حالات زندگی بشیر حسین عہ/۱۲

مجرمین جنگ۔ عثمان صحرائی (زیر طبع) عہ/۱۲

برنارڈ شا کا جہنم۔ مترجمہ آغا افتخار حسین (زیر طبع)

سہیل کی سرگزشت۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی عہ/۱۲ مضامین کا مجموعہ۔ دو روپیہ بارہ آنہ

کوہ نور کی سرگزشت۔ رہبر فاروقی عہ/۴

اردو ادب میں ظرافت (زیر طبع)۔

ناول۔ ڈرامے۔ افسانے

عشرت۔ دردناک معاشرتی ناول۔ ڈاکٹر عارف بٹالوی۔ دو روپیہ آٹھ آنے۔

مستقبل کے سوداگر (ناول) رضا زیدی عہ ۱۲؍

نکتہ چین ہے غم دل۔ بترجمہ آغا افتخار حسین عا ۱۲؍

کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں (افسانے)

ابراہیم جلیس۔ دو روپیہ بارہ آنے۔

مظلوم دوشیزہ۔ جون آف آرک فرانسیسی

دوشیزہ کے نہایت دردناک حالات ترجمہ

بروزجی۔ فیروز شاہ تاراپوری۔ تین روپیہ

چالیس کروڑ بھکاری۔ ابراہیم جلیس۔ عا ۱۲؍

تکونا دیس (افسانے) ایضاً۔ دو روپیہ ۱۲؍

بھوکا ہے بنگال (رر) ایضاً دو روپیہ ۱۲؍

آج کل کے رومان۔ (خواتین کے افسانے) عا ۱۲؍

سرنوشت (افسانے) مجنوں گورکھپوری۔ دو روپیہ

نظر میں۔ مظہر انصاری (افسانے) زیر طبع

ہچکیاں صوفیہ بیگم۔ تین روپیہ

موتیوں کا انڈا۔ کوثر چاندپوری ۷؍

ہیروں کی کان ایضاً ۷؍

چوہوں کی بستی۔ ایضاً ۷؍

بچوں کی کتابیں

حضرت ابوبکر صدیق رض الطاف شوکت بی اے ۷؍

حضرت عمر فاروق رض ایضاً ۷؍

حضرت علی رض ایضاً ۷؍

حضرت عثمان غنی رض ایضاً ۷؍

مشہور یادگاریں۔ اہر القادری ۷؍

لاہور کی رر الطاف شوکت ۷؍

دہلی کی یادگاریں ایضاً ۷؍

کانا باتی۔ عشرت رحمانی ۵؍

دیس ویس کی کہانیاں رر ۷؍

دونوں جہان والے رر ۷؍

اونچے نشان والے رر ۸؍

خوفناک درندہ۔ محمد بشیر شارق ۷؍

بہادر شہزادی رر ۷؍

مصطفےٰ کی بہادری۔ شارق دہلوی ۷؍

غلیفہ سارس رر ۷؍

لالچی گڈریا رر ۷؍